لغت نویسی کے مسائل

مرتبہ
گوپی چند نارنگ

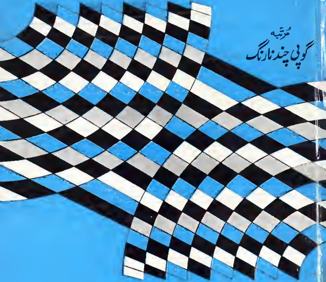

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

لغت نویسی کے مسائل

ماہنامہ کتاب نُما کی خصوصی اشاعت

لغت نویسی کے مسائل

مُرتبہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ

مَاہنَامہ کتاب نُما۔ جَامِعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

© متعلقہ مضمون نگار

مینیجنگ اڈیٹر: شاہد علی خاں
اڈیٹر: ولی شاہجہانپوری
مہمان اڈیٹر: پروفیسر گوپی چند نارنگ

جلد نمبر ۲۵، ضمیمہ شمارہ نمبر ۹، ستمبر ۱۹۸۵ء
قیمت سالانہ ۲۰ روپے، فی پرچہ ۲/۵۰
غیر ممالک کے لیے ۸۵ روپے

تقسیم کار

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار: ستمبر ۱۹۸۵ء   تعداد 750   قیمت: 35/-

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

فہرست

مقدمہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۷
۱۔ لغت نویسی کے مسائل	مالک رام	۱۳
۲۔ اُردو لغت نگاری کے مسائل	پروفیسر نذیر احمد	۱۹
۳۔ لغت نویسی	پروفیسر سیّد حسن	۳۳
۴۔ اُردو اور ہندی کا رشتہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۴۵
۵۔ اُردو لغت اور لغت نگاری	شمس الرحمٰن فاروقی	۵۷
۶۔ اُردو اور ہندی کی مشترک لفظیات میں فارسی اور مفرس عربی عناصر کا تجزیہ	ڈاکٹر عصمت جاوید	۱۱۹
۷۔ معیاری اُردو لغت: ایک خاکہ	ڈاکٹر محمد ذاکر	۱۳۰
۸۔ اُردو کی دو لسانی لغات	ڈاکٹر حنیف کیفی	۱۳۹
۹۔ اُردو لغت کا تنقیدی جائزہ	مسعود ہاشمی	۱۵۱

مقدمہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اُردو ہندی لغت نویسی پر ایک کل ہند سیمینار سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ مارچ ۱۹۷۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ سیمینار کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر پرتاپ چندر چُندر نے کیا تھا اور افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر مسعود حسین، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی تھی۔ ۱۶ مارچ کے اختتامی اجلاس میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین پروفیسر ستیش چندر نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس اجلاس کی صدارت مشہور ماہر لغت فادر کامل بلکے نے کی۔ افتتاحی اور اختتامی اجلاس کے علاوہ اس سیمینار کے پانچ سیشن منعقد ہوئے جن کی صدارت پروفیسر کرشنا مورتی، (صدر شعبۂ لسانیات، عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد)، جناب مالک رام، پروفیسر برجیشور ورما (آگرہ) پروفیسر ہربنس لال شرما (چیرمین سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ دہلی)، اور پروفیسر دیمتش (روس) نے کی۔ اس سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر گوپی چند نارنگ اور سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ڈاکٹر ستیش کمار روہڑا تھے۔ اس سیمینار کو کامیاب بنانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین، سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر گوپال شرما اور پروفیسر ڈاکٹر بال گوبند مشر نے پورا پورا تعاون کیا۔

اس سیمینار میں اُردو کی نمائندگی پروفیسر مسعود حسین خاں، جناب مالک رام، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب رشید حسن خاں، ڈاکٹر محمد ذاکر، ڈاکٹر عصمت جاوید،

ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر مظفر حنفی، جناب عبدالوحید، ڈاکٹر صغرا مہدی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ اس کے علاوہ ترقی اُردو بورڈ کے چیرمین جناب حیات اللہ انصاری اور ان کے علاوہ دہلی یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہرلال نہرو یونی ورسٹی اور متعدد بیرونی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور ماہرینِ لسانیات، نیز دہلی کے اُردو اور ہندی کے ادیبوں اور عالموں نے بھی بڑی تعداد میں اس سیمینار میں شرکت کی۔

اس سیمینار کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا جو تدوینِ لغت، خصوصاً اُردو اور ہندی لغت سازی کے مختلف پہلوؤں اور مسائل کا سنجیدگی اور گہرائی سے تجزیہ کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ دوسرے غالباً یہ پہلا اتفاق تھا جب کسی یونی ورسٹی یا ادارے کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے اساتذہ اور ماہرینِ لسانیات سر جوڑ کر بیٹھیں اور ہر طرح کے جذبات اور ذہنی تحفظات سے بلند ہو کر ان زبانوں کے مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کریں، نیز ہندی اور اردو کے رشتے، خصوصاً اس کی لفظیات کی یکسانیت اور اختلافات کا سائنسی اور معروضی نقطۂ نظر سے تجزیہ کریں۔ اس سیمینار سے یہ بات واضح طور پر اُبھر کر سامنے آئی کہ اُردو اور ہندی کے مشترکہ تعلقات کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اِن دونوں زبانوں کے بولنے والوں کی لفظیات میں مناسب اضافہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس سے ہندی اور اُردو کے درمیان حائل خلیج کو بھی کم کیا جا سکتا ہے۔

سیمینار کی مختلف نشستوں میں علمِ لغت: اصول و طریق کار، علمِ لغت اور جدید لسانیات، تنقیدی اور تحقیقی جائزے، ہندی اُردو لغت کے مسائل اور موجودہ صورتِ حال سے متعلق موضوعات پر مذاکرے ہوئے۔

پہلا سیشن علمِ لغت کے نظریاتی پہلو اور اصول و طریق کار سے متعلق تھا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر انّا ملائی (انڈین لینگویجز انسٹی ٹیوٹ، میسور) ڈاکٹر ستیش کمار روہڑا (سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ، دہلی)، اور ڈاکٹر محمد ذاکر (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے علمِ لغت کی ماہیت، لسانیات سے اُس کے تعلق، تدوینِ لغت کے عمل، الفاظ کی ماہیت اور علامت وغیرہ پر مقالات پیش کیے۔ ان مقالات پر پروفیسر رویندر ناتھ شری واستو

(دہلی یونی ورسٹی)، پروفیسر بال گوبند مشر (سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ) اور ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی (مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

دوسرے اجلاس کا موضوع تھا: ہندی اُردو لفظیات۔ موضوع کا آغاز پروفیسر گوپال شرما (ڈائریکٹر ہندی انسٹی ٹیوٹ) اور پروفیسر مسعود حسین (وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) نے کیا۔ پروفیسر شرما نے ہندی اور ہندستانی لفظیات کے رشتوں کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر مسعود حسین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بول چال کے نقطۂ نگاہ سے اُردو اور ہندی ایک زبان سہی مگر ادب، اصطلاحات وغیرہ کے لحاظ سے یہ دونوں مختلف زبانیں ہیں۔ پروفیسر نامور سنگھ (جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی) کا خیال تھا کہ یہ اختلاف جاگیرداری دور کی دین ہے جس کا آج کے زمانے میں کوئی جواز نہیں۔ لیکن پروفیسر نگیندر (دہلی یونی ورسٹی) کا نظریہ اس طرح سامنے آیا کہ ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں اور ان کا ادب ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال تھا کہ اُردو ہندی کا رشتہ بہت ہی گہرا اور پیچیدہ ہے۔ بنیاد کے اعتبار سے یہ ایک زبان ہیں لیکن دونوں کا ادبی ارتقا اس طرح ہوا ہے کہ اب یہ دو مستقل اور آزاد زبانیں ہیں۔ تاہم ان کے لسانی دائرے نصف کی حد تک ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں، اور ان کے مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت بھی ہندی کی سب سے بڑی طاقت اُردو ہے۔

تیسرا اجلاس ہندی اُردو لغات کے مسائل سے متعلق تھا۔ اس میں پروفیسر نذیر احمد (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کا مقالہ "اُردو لغات کے مسائل" اور ڈاکٹر عصمت جاوید (مرہٹواڑہ یونی ورسٹی) کا مقالہ "اُردو میں مستعمل عربی فارسی کے الفاظ" پڑھے گئے۔ نیز ڈاکٹر امر بہادر سنگھ (سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ، آگرہ): "اختلافِ معنی کا مسئلہ"۔ ڈاکٹر سریش کمار، ڈاکٹر سورج بھان سنگھ (سنٹرل ہندی سنستھان، آگرہ): "ماخذ و اصل" اور ڈاکٹر ٹھاکر داس نے اپنے مقالات پیش کیے۔ جو حضرات نہیں آسکے، ان کے مقالات ڈاکٹر مظفر حنفی اور جناب عبد الوحید نے پڑھ کر سنائے۔ جناب رشید حسن خاں (دہلی یونی ورسٹی) نے مقالات پر اظہارِ خیال کیا اور اُردو لغات

کے مسائل اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی۔

چوتھے اجلاس میں ہندی اُردو کے موجودہ لغات پر تنقیدی جائزے پیش کیے گئے۔ اس اجلاس میں مقالات پیش کرنے والے عالم تھے: ڈاکٹر ہردیو باہری (الٰہ آباد) — ایک لسانی ہندی لغات؛ ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواڑی (دہلی یونیورسٹی)۔ دولسانی ہندی لغات، جناب جیون نائک (سنٹرل ہندی ڈائرکیٹریٹ)۔ کثیر اللسان ہندی لغات؛ جناب مسعود ہاشمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)۔ ایک لسانی اُردو لغات۔ ان مقالات پر بحث میں شرکت کرنے والے حضرات تھے: پروفیسر داس وانی (جواہر لال نہرو یونی ورسٹی)، ڈاکٹر برجیشور ورما (الٰہ آباد) ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند، ڈاکٹر مظفر حنفی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور ڈاکٹر اسلم پرویز (جواہر لال نہرو یونی ورسٹی)۔

پانچواں اجلاس علم لغت کے عام مسائل سے متعلق تھا۔ اِس اجلاس میں لغت سے متعلق عام مسائل پر اظہار کے علاوہ جناب حنیف کیفی: ذولسانی لغات کا تنقیدی جائزہ، جناب للت موہن بہوگنا (سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ): پہاڑی فرہنگ؛ ڈاکٹر اوما شنکر ستیش (آگرہ): اصطلاحی لغت؛ اور جناب سدھیر ماتھر نے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی (جامعہ ملّیہ اسلامیہ)، جناب شیام سروپ شرما، جناب اشوک چکر دھر (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور ڈاکٹر سیتارام شاستری نے ان مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس طرح اُردو ہندی کے لسانی مسائل اور لغت نویسی کے مسائل پر یہ کل ہند سیمینار تین دن کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندی اور اُردو کے علما و ماہرین مل کر بیٹھے اور مشترکہ لسانی مسائل اور اپنی اپنی زبانوں کے مخصوص مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔ اس سے دونوں زبانوں کے درمیان انہام وتفہیم کے دروازے کھلے اور لسانی یگانگت اور تقاے باہم کی فضا تیار ہوئی۔

ہم مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے اس سیمینار سے متعلق 'کتاب نما' کا خاص نمبر نکالنا منظور کیا۔ اس میں صرف وہ مقالات پیش کیے جا رہے ہیں جو اُردو سے متعلق ہیں۔ پروفیسر سید حسن

اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مقالے اس سیمینار میں نہیں پڑھے گئے، لیکن چونکہ ان کا موضوع لغت نویسی ہے، اور یہ وقیع مقالے ہیں، ان کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ ہندی اور انگریزی مقالات مع مباحث کے کتابی شکل میں سنٹرل ہندی انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوں گے۔ اس سیمینار کو کامیاب بنانے میں جن حضرات نے علمی اور عملی تعاون فرمایا، وہ دو چار نہیں بیسیوں ہیں۔ ان سب رفقا، اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ نیز ان تمام دوستوں اور کرمفرماؤں کے ہم تہِ دل سے ممنون ہیں جن کے تعاون، کوشش اور لگن کے بغیر یہ مذاکرہ منعقد ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حضرات اسی طرح جامعہ کی علمی روایت کے فروغ میں جی جان سے مدد کرتے رہیں گے۔

شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

گوپی چند نارنگ

مالک رام

لغت نویسی کے مسائل

بنیادی طور پر لغت مجموعہ ہے کسی زبان کے الفاظ کا. جس طرح کسی شخص واحد یا کسی تجارتی اور صنعتی ادارے کی حیثیت اور ساکھ کا اندازہ اس کے راس المال سے کیا جاتا ہے، اسی طرح ہم کسی زبان کی ترقی اور قوتِ اظہار کا اندازہ اس کے ذخیرۂ الفاظ سے کرینگے۔ اگر زبان میں ہر موقع و محل کی مناسبت سے لفظ موجود ہے اور وہ ہر طرح کے موضوع کی وضاحت و تشریح پر قادر ہے، تو ہم اسے کامل اور ترقی یافتہ زبان تسلیم کر لینگے۔

اردو کی تصنیفی عمر کچھ زیادہ نہیں؛ یہی کم و بیش دو ڈھائی سو برس ہوگی۔ ابتدائی دور میں مذہب اور تصوف کا غلبہ رہا۔ یوں بھی زبان تشکیلی مراحل طے کر رہی تھی اور اس میں ہنوز الفاظ کا ذخیرہ اتنا نہیں تھا کہ وہ زیادہ موضوعات پر لکھنے کے لیے بےتکلف استعمال کی جا سکتی. لیکن اس عبوری دور کے بعد اس میں وسعت بھی پیدا ہوئی اور استعمال میں تنوع بھی۔ اب بعض اصحابِ علم کو توجہ ہوئی کہ اس نئی زبان کا لغت مرتب کیا جائے۔ چنانچہ اچھے بُرے متعدد لغت وجود میں آ گئے، جو آپ کے سامنے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ لغت کا کام اتنا آسان نہیں، جتنا معلوم ہوتا ہے یا سمجھ

لیا گیا ہے۔ پہلے تو تمام کتابوں کا پڑھنا اور ان میں سے الفاظ یکجا کرنا ہی کون سا سہل کام ہے! اردو کے سلسلے میں یہ دشواری مزید ہے کہ آج تک سارے متن شائع ہی نہیں ہو سکے۔ کسی ایک کتابخانے میں اردو کا سارا ذخیرہ موجود نہیں، بلکہ ہندستان میں بھی نہیں۔ متعدد خطی نسخے، بیرونِ ملک کے کتابخانوں میں ہیں ——— کوئی پورب میں، کوئی پچھم میں؛ کوئی اُتر میں اور کوئی دکن میں۔ چند سال اُدھر تک تو ان تک رسائی بھی ناممکن تھی۔ اب عکس لینے کی سہولت میسّر ہوگئی ہے۔ آپ گھر بیٹھے اپنے مطلوبہ مخطوطے کا عکس، دنیا کے کسی کونے سے منگوا سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام کتابوں کے عکس جمع کرنا، انھیں پڑھنا اور الفاظ کی فہرستیں بنانا —— اس کے لیے وقت درکار ہے۔

الفاظ جمع کر لینے کے بعد اب لغت کے مرتّب کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ لغت کی بنیادی غرض الفاظ کے معانی پیش کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی زبان میں بھی کوئی دو لفظ کامل طور پر ہم معنی نہیں؛ ان میں کچھ نہ کچھ امتیازی خصوصیت اور باریک فرق ضرور ہوتا ہے۔ جب ہم ایک لفظ کے معنی میں دوسرا لفظ بطور مرادف درج کرتے ہیں، تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ دونوں لفظ ہر پہلو سے ایک ہی مفہوم کے نشان ہیں، بلکہ یہ کہ دوسرا لفظ پہلے سے قریب ترین ہے۔

اردو میں آج تک یہ روایت رائج رہی ہے کہ الفاظ کے معانی کی سند میں شعرا کا کلام پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ طریقہ ناکافی اور ناقص تھا۔ زبان میں ہزارہا ایسے الفاظ ہیں، جو شعرا نے اپنے کلام میں استعمال نہیں کیے۔ کیا اس سے ان کی صحت مشکوک ہوگئی؟ کیا اس سے ان کے مفہوم یا معنی کے تعیّن میں کوئی دشواری پیش آئی؟ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ بارے اب یہ احساس ہو چلا ہے کہ اسناد میں شعرا کے علاوہ نثر نگاروں کا کلام بھی پیش کرنا چاہیے۔

لغت کا دوسرا مقصد الفاظ کا املا اور تلفّظ متعیّن کرنا ہے۔ بلکہ یہ شاید پہلا مقصد ہے۔ اِدھر کچھ دن سے املا پر خاص توجہ دی جانے لگی ہے۔ غلطیوں کی اصلاح تو بہر حال ہونا چاہیے، لیکن اندیشہ ہے کہ ہم اغلاط کا ازالہ کرتے کرتے کہیں

افراط و تفریط کا شکار نہ ہو جائیں! ایک دو مثالیں بے محل نہ ہوں گی۔
اصول بتایا گیا ہے:

"مرکب لفظ جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں، آپس میں ملاکر نہ لکھے جائیں بلکہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جائیں۔"

اصول کے وضع کرنے والوں نے اس کے لیے کوئی وجہ یا دلیل نہیں دی۔ بس، تحکمانہ ایک حکم دے دیا۔ اور ستم یہ کہ اس کے بعد جو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں لفظ اور سابقہ و لاحقہ میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ مثالوں میں یہ لفظ شامل ہیں: آج کل، شاہ جہان آباد، ان جان، ان پڑھ، ہم شیر، کم تر، آہن گر۔
ظاہر ہے کہ یہ سب الفاظ ایک نوع کے نہیں۔ آج کل اور شاہ جہان آباد میں واقعتاً دو دو لفظ جمع ہیں۔ ان جان اور ان پڑھ میں دو لفظ نہیں، بلکہ "ان" سابقہ ہے، جو نفی کے معنی دیتا ہے؛ یہ سابقہ آزادانہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہی نہیں۔ ہم شیر کی بھی یہی صورت ہے۔ "ہم" سابقہ معیت کی کیفیت کی نشاندہی کرتا ہے، آپ بھی آزادانہ اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔ کم ترمیں بھی دو لفظ نہیں۔ "تر" تفضیل بعض کا نشان ہے۔ "گر" بھی فاعلی لاحقہ ہے۔
یہی صورت "نے"، نافیہ کے سابقہ کی ہے۔ یہ سابقہ بھی اکیلا ان معنوں میں کبھی مستعمل نہیں ہوتا؛ ہمیشہ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر بامعنی بنتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ اصول بنانے کے بعد لکھا جاتا ہے:

"البتہ وہ مرکبات جو مفرد لفظ کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، ان کو توڑ کر نہ لکھا جائے۔"

اور اس کی مثالیں ہیں: پاسبان، کرخندار، بچپن، غمگین، باغیچہ۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ یہ سب مثالیں دو لفظوں کی نہیں، بلکہ ایک لفظ اور ایک لاحقے کی ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ اصول ہی غلط ہے۔ اور آج تک کسی نے اس کی پابندی نہیں کی۔ مثال میں "آب" کے مرکبات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ پنجاب اور گرداب کو دیکھیے۔ یہ اگرچہ دو دو لفظ تھے، لیکن واضع نے انھیں ایک لفظ

بنایا اور اس کا ثبوت یہ کہ آپ کے الف ممدودہ کو مقصورہ میں تبدیل کردیا۔ یہ الفاظ اس ذیل میں نہیں آتے، جو" مفرد لفظ کا درجہ حاصل کرچکے ہیں" بلکہ یہ عمداً مرکب شکل میں مفرد بنائے گئے تھے۔

غرض یہ کہ تمام وہ الفاظ جو مفرد شکل میں درج لغت ہوتے ہیں، خواہ وہ اصل میں دو یا زیادہ لفظوں کے جمع کرنے سے کیوں نہ وضع ہوئے ہوں، انھیں ملاکر لکھنا چاہیے، انھیں توڑنا رجعتِ قہقہری کے مرادف ہوگا۔ یہی صورت سابقہ اور لاحقہ والے لفظوں کی بھی ہے۔ یہ بھی توڑ کر نہیں لکھے جاسکتے۔

ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ حکم ہوتا ہے :

"گا، گی، گے کو افعال کے ساتھ ملاکر نہیں، بلکہ الگ الگ لکھنا چاہیے"

یہاں بھی کوئی وجہ یا دلیل نہیں دی گئی ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا جائے! اور یہ اصول بھی غلط ہے؛ اور ان حکم دینے والوں کا اپنا عمل اس کے خلاف ہے۔ اصول یہ ہے کہ اردو میں فعل حال" امر" پر" تا ہے"، "تے ہیں"، "تی ہے" کے اضافے سے بنتا ہے، جیسے کرتا ہے، کرتے ہیں، کرتی ہے، پیتا ہے، پیتے ہیں، پیتی ہے۔ اسی طرح فعل مستقبل کے بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ مضارع پر گا، گے، گی کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ گا، گے، گی کو اصلی مضارع سے الگ لکھا جائے۔ اگر یوں ہے، تو حال کے نشان کو بھی امر سے الگ کیوں نہ لکھا جائے؟ یہ یک بام و دو ہوا کیوں؟ کیا آپ لکھیں گے : گھوڑا پانی پی تا ہے یا بلی دودھ پی تی ہے۔ یقیناً یہ حضرات پیتا اور پیتی لکھیں گے۔ مصدر میں امر پر" نا" کا اضافہ ہوتا ہے۔ کیا کوئی اس لاحقے کو الگ لکھے گا! اسی لیے میں نے کہا کہ" ان حکم دینے والوں کا اپنا عمل اس کے خلاف ہے" اگر آپ" مستقبل میں یہ اصول نافذ کرنا چاہتے ہیں، تو اسے" حال" میں اور" مصدر" میں بھی نافذ کرنا پڑیگا۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ اصول سرے سے ٹھیک ہی نہیں۔ یہ حال اور مستقبل کے نشان لاحقے کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام لاحقوں کی طرح جزوِ کلمہ ہیں، انھیں

الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بنیادی لفظ کے ساتھ مِلا کر لکھے جائیں گے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، املا میں اصلاح اپنی جگہ، لیکن اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انتشار اور بدنظمی کے شکار ہو جائیں۔

اب لغت کا ایک اور ضروری جزو الفاظ کے ماخذ کی نشاندہی بھی ہے۔ یہ اور بھی مشکل اور جان لیوا کام ہے۔ جس طرح دنیا کی کوئی قوم یہ دعوا نہیں کر سکتی کہ وہ کسی خالص نسل سے ہے اور اس میں کسی اور قوم کا خون نہیں ملا، اسی طرح دنیا کی کوئی زبان بھی یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس میں کسی اور زبان کی آمیزش نہیں ہوئی۔ موجودہ نسلِ انسانی کے آبا و اجداد قدیم زمانے میں خدا معلوم کہاں کہاں، گھومتے پھرتے رہے! جانے اس خانہ بدوشی اور ہرزہ گردی کے دور میں ان کا کن کن لوگوں سے واسطہ پڑا، جن سے ان کی بول چال، رہن سہن، طور اطوار متاثر ہوئے۔ ایسے میں آج کسی کا کہنا کہ کوئی زبان خالص اور بے میل ہے، ماننے کی بات نہیں۔ اردو کا معاملہ تو اور بھی مشکل ہے۔ ہندستان میں بیسیوں زبانیں اور بولیاں ہیں، لامحالہ اردو کی ساخت پرداخت پر ان کا اثر پڑا ہوگا۔ پندرھویں سولھویں صدی سے یہ ملک یورپ کی مختلف اقوام کی آماجگاہ رہا ہے۔ ہر ایک کی زبان الگ اور ہر ایک کا حلقہ اثر الگ۔ ان زبانوں کے الفاظ بھی ہم نے کبھی جوں کے توں اور کبھی توڑ مروڑ کر اپنا لیے۔ یہ ہماری بول چال میں یوں رس بس گئے ہیں کہ آج کسی کو سان گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے اپنے گھر کے دیے کی روشنی نہیں، بلکہ مانگے کا اُجالا ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ "اناڑی" لیجیے۔

آج سے ہزاروں سال پیشتر آریہ لوگ اس ملک میں وارد ہوئے۔ آریہ کے لغوی معنی ہیں شریف معزز آدمی۔ انھوں نے اپنی ہیکڑی دکھانے کو یہاں کے باشندوں کو اَن۔آریہ (اناریہ) کا خطاب دے دیا، بالکل اسی طرح جیسے عربوں نے اپنی زبان کی برتری اور فصاحت و بلاغت کا سکہ بٹھانے کو تمام غیر عربوں کا نام عجم (یعنی گونگا) رکھ دیا تھا۔ آپ نے کئی لوگوں کے نام کے ساتھ ذات کا نشان نایر یا نیّر دیکھا ہوگا، وہ دراصل یہی اناریہ تھا، جو مرورِ زمانہ سے نایر اور نیّر بن گیا؛ اور اسی سے ہمارا لفظ اناڑی بنا ہے۔ معنوں میں تغیر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اب ہم اسے احمق، بیوقوف، ناتجربہ کار کے معنوں میں بولتے ہیں۔

ایک اور لفظ لیجیے "کہرام"، بمعنی رونا دھونا، شور و شیون، واویلا۔ بعض اصحاب نے اسے قہر عام کی بگڑی ہوئی شکل لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ آپ نے ہندوؤں کی ارتھی شمشان گھاٹ جاتے ضرور دیکھی ہوگی۔ جنازے کے ساتھ جانے والے لوگ وقفے وقفے سے کہتے جاتے ہیں: کہو رام! بھائی کہو رام! رام رام ست (ستیہ) ہے۔ کچھ لوگ (خاص کر عورتیں) بین بھی کرتی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک ہمارا لفظ "کہرام" اسی "کہو رام" کی دوسری شکل ہے۔

مدعا یہ ہے کہ الفاظ کے ماخذ کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہم پوری کوشش کے باوجود صحیح ماخذ معلوم کرنے میں ناکام رہیں۔

میں اپنی طولِ کلامی کے لیے معذرت طلب ہوں۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ لغت نویسی خاصا مشکل اور پیچیدہ کام ہے، جس میں قدم قدم پر لغزش کا امکان ہے۔ اس لیے میں ایک درخواست پر اپنی گفتگو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

ہمیں پرانے لغت نویسوں کا شکرگزار ہونا چاہیے، جنھوں نے وسائل کی کمی کے باوجود تنِ تنہا لغت کے اتنے مبسوط اور مفید مجموعے مرتب کر دیے۔ اندازہ لگائیے کہ اگر آج فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات اور جامع اللغات ہمارے پاس نہ ہوتے، تو ہم اردو والوں کا کیا حال ہوتا! اگر ان کتابوں میں کوئی غلطی پائی جائے تو اس سے ان کے مؤلفوں کے علم و فضل یا محنت و کاوش کے اعتراف میں کمی نہیں آنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ان کتابوں کی کوتاہیوں کا علم بھی خود انھی کتابوں سے ہوا ہے۔ ہمارے لیے ان لغتوں کو نظر انداز کرنے یا ان پر لعن طعن کرنے کی وہی مثال ہوگی کہ ایک بچہ اپنے باپ کے کندھے پر چڑھا، اچھل اچھل کر خوش ہو رہا تھا کہ میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ وہ بھول گیا کہ اس کے قد میں اس کے والد کا قد بھی شامل ہے۔

بیشک ہمیں لغت کا کام جاری رکھنا اور اسے آگے بڑھانا چاہیے۔ زبان بڑھتی دولت ہے، لہٰذا لغت کا کام کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے پیشروؤں کے کام کا اعتراف کرنا چاہیے اور ان کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے۔

پروفیسر نذیر احمد

اُردو لغت نگاری کے مسائل

کسی زبان کا لغت اس زبان کے بولنے والوں کے مزاج و افکار کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے کہ لغت، ملک و قوم کے بہترین دماغوں کی برسوں کی مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے، لغت کا عمل مسلسل اور دائمی ہوتا ہے۔

لغت کے اغراض و مقاصد بے پایاں وسیع ہوتے ہیں، الفاظ لغت میں اکائی کا کام دیتے ہیں، کسی ملک و ملت میں جتنے مروّج الفاظ ہیں ان کے معانی، املا، تلفظ، ان کی اصل، ان کی تاریخ، تغیرِ زبانی، استعمال کے مختلف طریقے، ان کی دستوری حیثیت وغیرہ تمام مسائل کا تعین لغت کے حدود میں ہے۔ ادب و زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا لغت سے گہرا رشتہ نہ ہو، گویا کائنات کی پہنائی لغت اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لغت نویسی ایک نہایت مشکل فن ہے جس کی ترقی ملک کے بہترین اذکار کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک اور اعتبار سے لغت کی عمومیت اور ہمہ گیری مسلّم ہے۔ لغت سے ہر شخص کا سروکار رہتا ہے۔ عالم، عامی، چھوٹا، بڑا، مورّخ، محقق، انشا پرداز، شاعر، ادیب، سائنس داں، غرض ہر شخص کو لغت سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، اس کی بنا پر جہاں لغت مصنّف کی شہرت کا ضامن ہے، وہاں وہ سب سے

زیادہ ہدف ملامت بھی ہوتا ہے، چونکہ لغت اپنے اپنے حدود کے لحاظ سے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، لیکن استفادہ کرنے والا تو اپنے مسئلے کا حل اس کے ذریعے تلاش کرتا ہے اور ناکام ہونے پر مولف کو ہرطرح سے مورد الزام ٹھہراتا ہے، دنیا میں علم کی جتنی شاخیں ہیں ان سے لغت کا اتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے کہ شاید ہی کسی دوڈسپلین میں موجود ہو۔

لغت نویس کے کام کا سب سے دشوار پہلو یہ ہے کہ اس کو خیالات و معانی جیسی غیرمرئی چیزوں کی لفظی تصویریں پیش کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر الفاظ کے معنی مترادفات سے بیان کردیے جاتے ہیں، یہ در اصل معنی نہیں بلکہ آلہ ہیں جن کے ذریعے معانی تک ذہن کی رسائی کرائی جاتی ہے، پھر الفاظ کے مختلف معانی میں اتنا خفی و دقیق فرق ہوتا ہے کہ اس کا احاطہ تحریر نہیں کرسکتی۔ ان کی تشریح سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بسا اوقات سعی لاحاصل ہوتی ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں اب میں اُردو لغت نگاری کے بعض مسائل کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اردو لغت نویسی کے مسائل اور زبانوں کے مقابلے میں کچھ پیچیدہ تر ہیں، اس کی دو وجہیں ہیں، اوّل زبان کا مخصوص مزاج اور اس کے بعض خواص۔ دوم اکثر لغت نویسوں کی لغات کے اہم مسائل سے کم واقفیت اور اس اہم فن کی طرف عام لوگوں کی کم توجہی۔

مسئلہ تعیّن الفاظ: لغت نویس کو سب سے پہلے الفاظ کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ اس کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون سے الفاظ اُسے اپنے لغت میں داخل کرنا ہیں۔ گویا یہ طے کرنا اُردو لغت نویس کے فرائض میں ہے کہ کس لفظ کو اُردو کا لفظ قرار دیں۔ بادی النظر میں یہ مسئلہ بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہ انتہائی دشوار اور اختلاف آرا مسئلہ ہے۔ اگر آپ اُردو کے لغات پر سرسری نظر ڈالیں تو اس اعتبار سے ان میں خاصے اختلافات پائیں گے۔ کسی لغت میں عربی و فارسی کے سیکڑوں الفاظ ایسے نظر آئیں گے جن سے دوسرا لغت خالی ہے۔ اس کے

برخلاف بعض لغات میں ہندی کے ثقیل اور بوجھل الفاظ کی بھرمار ملتی ہے۔ ایک لغت ایسا ہے جس میں عوامی استعمال کے الفاظ جگہ جگہ مل جائیں گے، دوسرا ان سے مطلق خالی ہوگا۔ ایک میں سیکڑوں جغرافیائی و تاریخی نام ملیں گے جن کا دوسرے میں نام ونشان نہ ملے گا۔ پھر زبان کے ادبی سرمائے بھی اس مسئلے کا حل پیش نہیں کرتے، ان میں بھی کافی اختلاف موجود ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اس اختلاف آرا معاملے میں اہلِ زبان نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں صادر کیا جس پر اکثریت کا عمل ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ کسی ایک جماعت کی طرف سے کسی ایک مخصوص وقت میں نہیں ہوتا، بلکہ اس عمل میں تسلسل درکار ہے جو اردو زبان میں مفقود ہے، اس کی وجہ سے اکثر لغات ناقص اور لغت نویس موردِ الزام قرار پاتا ہے۔

علاوہ بریں لغت نویس کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ اصیل اور غیر اصیل کا فرق بتائے، محرّف اور متروک کا تعین کرے، شاذ اور قلیل الاستعمال کا امتیاز بھی۔

یہ سارے دقیق و نازک مباحث جو قوم کی پوری صلاحیت کے استعمال میں آنے کے بعد ہی حل ہو سکتے تھے، اردو میں مسئلہ لاینحل بنے ہوئے ہیں۔ ان امور میں صدہا اختلاف پائے جاتے ہیں، اس وجہ سے لغت نویس کی مجبوری پر ترس آتا ہے۔

اردو زبان کا یہ المیہ ہے کہ اب تک اس زبان کے الفاظ کے تعین کا مسئلہ قابل اطمینان حد تک طے نہیں ہو سکا ہے۔

لغت نویس کا دوسرا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کی املائی صورت کا تعین کرے، اردو زبان میں کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں جو اپنی املائی صورت برقرار رکھے ہوئے ہیں، اس کی بنا پر املائی مسائل کچھ دشوار ہو گئے ہیں۔ اس میں اردو رسم خط کی وجہ سے بھی دشواری پیدا ہو گئی ہے۔ دراصل اردو میں متعدد حروف ایسے ہیں جن کے لیے اردو میں کوئی آواز نہیں، یہ املائی دشواریوں کی اصل بنیاد ہے۔ س، ث، ص کی ایک آواز ہے، ط، ت کی آواز

اُردو میں مشابہ ہے۔ ذ، ز، ض، ظ کی آواز میں اُردو کی حد تک کوئی فرق نہیں۔ ع، الف کی آواز یکساں ہے۔ بعض حرف یا علامتیں اصلاً زائد ہیں۔ مثلاً ہمزہ، تنوین، واو معدولہ، ہائے مختفی، الف مقصورہ؛ ان میں ہر ایک کسی نہ کسی املائی دشواری کا موجب ہے۔ قصائی، مصالحہ، مصرا، مثِل کی یہ صورتیں اصلاً غلط ہیں۔ ان میں آخری تین ہندستانی لفظ ہیں اور ان کو 'س' سے لکھنا چاہیے۔ پہلے کی اصل مشتبہ ہے لیکن 'ص'، اس میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ طپانچہ، طوطا، غلطاں، طپش وغیرہ الفاظ میں 'ط'، کا استعمال سراسر غلط ہے۔ گذشتہ، سرگذشت، رہ گذر میں ذال اور گزارش، خدمت گزار میں 'ز' ہے۔ اُردو میں الف مقصورہ (یعنی ی کے اوپر الف) کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے۔ تماشا، معما، مصلا، لیلا، ادنا، اعلا، مولا، معلاّ، تقوا، فتوا، کبرا کی طرح کے الفاظ میں الف مقصورہ ہے، اس کی بجائے الف کا استعمال زیادہ مناسب ہوگا۔ فارسی میں بھی الف مقصورہ کے حذف کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ اُردو میں ہمزہ کا تلفظ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر عربی کے الفاظ 'ی' سے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے خصایل، فصایل، قصاید؛ یہی عمل ایران میں بھی ہو رہا ہے۔ "ء" کے استعمال کا اثر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ فارسی کے الفاظ میں اس کو بے تکلفی سے برتتے تھے جیسے بائد و شائد لیکن جہاں دو واو کی آواز نکلتی ہے، وہاں ہمزہ کا استعمال اُردو اور فارسی دونوں میں جائز رکھا گیا جیسے طاؤس، داؤد، لکھنؤ وغیرہ۔ تنوین کا عمل عربی الفاظ تک محدود ہے۔ الف کے اضافے کے بعد اس پر دو زبر لگا دیا جاتا ہے۔ البتہ جن لفظوں میں آخری حرف "ہ" ہو، ان پر عربی میں بغیر اضافہ الف، تنوین لگاتے ہیں، لیکن اُردو میں رجحان یہ ہے کہ اس صورت میں بھی الف کا اضافہ ہونا چاہیے۔ واو معدولہ کا استعمال ترک نہیں ہوا ہے، اس لیے خورشید میں حذف واو درست نہیں۔ غالب "خرشید" بحذف واو لکھتے تھے؛ ہائے مختفی خالص فارسی علامت ہے لیکن اب اُردو اور ہندی میں بلا تکلف استعمال ہوتی اور الف کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ جیسے بھوسہ، بھروسہ، پتہ، ٹھپہ، باجہ، راجہ، باڑہ، ٹونڈلہ، کلکتہ، گونڈہ، اترولہ، پٹنہ وغیرہ میں ہائے مختفی کا استعمال بے محل ہے، بہرحال اسماء علم میں ان کا حذف دشواری کا موجب ہے، البتہ عام اسما میں ان کا

ترک اولیٰ ہے، غضب یہ ہے کہ تماشا، معتا جو الف مقصورہ سے ہیں، ان میں بھی اکثر ہائے مختفی کا عمل جاری کر دیتے ہیں۔

غرض املا کے مسائل خاصے پیچیدہ ہیں، لیکن حال میں رشید حسن خاں کی اہم کتاب کی اشاعت نے اس سلسلے کے اکثر مسائل حل کیے ہوں گے، گو اختلافات کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ اسی سال کسی نے فارسی میں ذال کے وجود سے انکار کرتے ہوئے انجمن ترقی اُردو کے رسالے 'ہماری زبان' میں ایک مختصر سا مضمون شائع کیا تھا۔ راقم حروف نے اس کے جواب میں ایک مختصر یادداشت 'ہماری زبان' کے ایک شمارے میں شائع کی۔ کچھ دنوں بعد ایک دوسرے بزرگ نے پھر ذال کے بارے میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا جیسا کہ ایک صاحب قبلاً کر چکے تھے۔ یہ بزرگ بھی زبانوں کی اصل سے بیگانے ہیں جیسے کہ پہلے بزرگ تھے۔ ان گزارشوں سے ظاہر ہے کہ ابھی اُردو دنیا املا کے مسائل کی طرف سے مطمئن نہیں، لیکن اس کے باوجود یہ بات مسلّم ہے کہ رشید حسن خاں کی ضخیم کتاب اور پروفیسر نارنگ کے مختصر رسالے کی اشاعت سے لغت نویس کو بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

لغت نگار کا تیسرا اہم فریضہ ضبط تلفظ ہے۔ جب بھی تلفظ کے بارے میں کوئی شبہ یا اختلاف پیدا ہوتا ہے تو لغت ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں ابھی تک خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے۔ یہ مسئلہ بھی خاصا مشکل ہے اور منجملہ اور اسباب کے سب سے قابل توجہ بات یہ ہے کہ اُردو رسم خط میں حرکات کے لیے الگ حروف متعین نہیں ہیں، اس کی بنا پر الفاظ کے اندر ان کا شمول نہیں ہوتا اور یہ صورت عربی رسم خط کی پیروی کا نتیجہ ہے، لیکن عربی زبان میں حرکات (زیر، زبر، پیش) سے قواعد کا کام لیتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا تعین اہل عرب کی سرشت کا جزو بن چکا ہے۔ اس کے برخلاف فارسی اور اردو میں ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصل کی پیروی ہو۔ زبر، زیر، پیش سے الفاظ کے معانی میں جو تغیر ہوتا ہے وہ فارسی اور اُردو کے اعتبار سے بے معنی ہے۔ مثلاً مُعزّز، مُعزِز۔ مرسَل، مرسِل۔ مُقام، مَقام میں جو فرق ہے وہ اُردو میں ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طرح مَحبت کو مُحبت پڑھنے سے کوئی فرق واقع

نہیں ہوتا، لیکن عربی کے اعتبار سے معزّز کی جگہ معزز پڑھیں تو شاید ہنگامہ برپا ہوجائے، اسی طرح مرسَل کے بجائے مرسِل پڑھنے سے خدا کی عدالت میں مجرم ثابت ہوگا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں ہر لفظ اکائی نہیں، بلکہ لفظ کا مادّہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے، مادّے ہی سے چند مخصوص اصول کے اعتبار سے سارے الفاظ بنائے جاتے ہیں اور ان مخصوص اصول میں حرکات کا خاص دخل ہے اس وجہ سے اہل عرب پر طبعی طور پر حرکات کا تعیّن آسان ہے، لیکن فارسی اور اُردو میں لفظ اکائی ہے، مادّہ بے معنی اور بے اثر۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی میں کم اور اُردو میں بہت زیادہ حد تک لفظ کی ہیئت میں کافی تبدیلی ہوئی کہیں اس میں حذفِ حرکات سے، کہیں اضافۂ حرکات سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً مَرَض رمضان، شفقت، کلمہ، علوی، حرکت، برکت، رضوی وغیرہ کے حرفِ دوم کو ساکن کر لیا گیا ہے۔ اس کے برعکس عَرْض، قرْض، صِفْر، مُفْت وغیرہ میں حرفِ دوم کو متحرک کر لیا گیا ہے۔ مُوسِم میں حرفِ اوّل و سوم مفتوح ہو گئے اگرچہ اصلاً اوّل مضموم اور سوم مکسور ہے۔ اسی طرح سیّد میں حرفِ دوم "ی" اصلاً بالکسر ہے مگر ہمارے تلفظ میں بالفتح آیا ہے۔ یہ طویل گفتگو خود ایک الگ کتاب کی مقتضی ہے، لیکن اُردو میں ابھی یہ مسئلہ ابتدائی طور پر حل نہیں ہوا، اس کی وجہ سے لغت نویس کو سخت دشواری کا سامنا ہے۔

بعض دستوری مسائل : لغات قواعد کے سارے مسائل کا احاطہ نہیں کرتے۔ اس کا دائرۂ عمل تذکیر و تانیث، واحد و جمع، اسم، فعل، صفت وغیرہ کے تعین تک محدود رہتا ہے، مگر اردو پر عربی و فارسی اثرات نے اس معاملے میں کچھ دشواری پیدا کردی ہے، لیکن چونکہ ان میں سے اکثر مسائل کی توضیح قواعد کی کتابوں میں ہوچکی ہے، اس لیے لغت نویس کو چنداں دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔ پھر بھی چند مسائل سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً تذکیر و تانیث سے متعلق امور اختلاف آرا ہیں۔ خصوصیت سے دبستانوں کا فرق، پھر ایک دبستان کے لوگوں میں اختلافات وغیرہ کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ عربی کی بعض جمعیں اُردو میں کثرت سے شامل ہیں، ان سے بعض مسائل وابستہ ہیں،

خصوصاً جب صفت موصوف کی تطبیق کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ عربی میں تذکیر و تانیث، فاعل، مفعول وغیرہ امور میں صفت، موصوف کے تابع ہوتی ہے۔ اُردو کی طرح عربی میں بھی بے جان اسم تذکیر و تانیث کے اصول کا پابند ہے، پس صفت بھی اس کے تابع ہوگی، اور بے جان اسم جمع کی حالت میں مونث ہوجاتا ہے، تو ایسی صورت میں صفت کو بھی مونث بنانا پڑتا ہے۔ اسی اصول کے تحت نفس ناطقہ، قوۃ دافعیہ، عادۃ ثانیہ، امور خارجہ، علوم اسلامیہ وغیرہ آتے ہیں۔ لفظ 'کتاب' عربی میں مذکر ہے، اس بنا پر اس کے ساتھ صفت بھی مذکر آئے گی۔ مثلاً کتابِ عالی، لیکن جمع کی صورت میں کتب عالیہ ترکیب دُرست ہوگی۔ بہرحال عربی زبان کا یہ قاعدہ فارسی اور اُردو دونوں میں یکساں رائج ہے۔ قواعد کی کتابوں سے رہنمائی کے باوجود اس سلسلے کے بعض مسائل کا تعلق لغت سے بھی باقی رہتا ہے۔

عربی جمع کے بعض قاعدے فارسی اور اردو میں اتنے عام ہو گئے ہیں کہ کچھ فارسی لفظوں میں ان کا استعمال ہونے لگا ہے جیسے باغات، زمینات، پرگنہ جات، گزارشات، فرمودات وغیرہ، ان کے بارے میں لغت سے ہدایت کی بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔

عربی جمعیں عام اس سے کہ اسم مذکر ہو یا مونث، دبستانِ لکھنؤ میں مذکر مگر دہلی میں مذکر کی جمع مذکر اور مونث کی مونث ہوتی ہے۔ اس کلیے میں استثنائی صورت بھی پائی جاتی ہے، لغت میں ان کا اندراج ضروری ہے۔

ماخذ لسانی: جیسا کہ معلوم ہے اُردو میں عربی و فارسی اور سنسکرت کے علاوہ کافی الفاظ ترکی کے بھی شامل ہیں۔ اوّل تو یہ بتانا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے، آسان کام نہیں۔ عربی و فارسی الفاظ کے درمیان تمیز کرنے میں بسا اوقات سخت دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مشکل کام لفظ کے ماخذ کا پتا چلانا ہے۔ عربی زبان سے جو الفاظ ماخوذ ہیں، اکثر حالتوں میں ان کے مادّے کا تعین آسان ہوتا ہے۔ سنسکرت

سے جو الفاظ آئے ہیں، ان میں بھی کسی قدر آسانی ہوتی ہے، اس لیے کہ سنسکرت کی قواعد کے اصول وضوابط نہایت پختگی سے منضبط اور لغت کے مسائل بڑی حد تک حل ہو چکے ہیں، اس لیے اُردو میں مستعمل الفاظ کی اصل کا پتا چلانا ممکن ہے، مگر فارسی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے۔ اس زبان میں عربی کے الفاظ کے ماسوا جو فارسی کے اپنے الفاظ ہیں ان میں سے اکثر کی اصل نامعلوم ہیں۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں، اوّل ایران کی قدیم زبانوں یعنی اوستا، فارسی باستان اور پہلوی وغیرہ کا بیشتر ادبی سرمایہ دستبردِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے، گویا اصل کا وجود ہی باقی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ لغت کی تدوین ایران میں کم اور ہندستان میں زیادہ ہوئی اور دورِ قبلِ اسلام کے کافی بعد جب کہ قدیم زبانوں کے شناسا باقی نہیں رہ گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں فارسی الفاظ کی اصل کا پتا لگانا سخت دشوار امر ہے۔ خود فارسی فرہنگ نویس ان سے عاجز آ چکے ہیں، اُردو والوں سے اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے، البتہ ترکی کے الفاظ کی اصل کا پتا لگانا گو دشوار ہے لیکن ان کی تعداد کم ہے، اس لیے لغت نویس پر ان کا بار نسبتاً کم ہے۔ اردو کے لغات ماخذ لسانی کے تعین کے اعتبار سے خاصے ناقص اور ناقابلِ اعتنا ہیں۔

ضبطِ معانی: لغت کا بنیادی اور اصلی کام یہی سمجھا جاتا ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ لفظ کے معنی مترادفات کے ذریعے بیان کر دیے جائیں۔ اوّل تو ایسے لفظ کم ہیں جن کے ہو بہو ہم معنی لفظ مل جائیں، دوم اصولاً یہ بات صحیح بھی نہیں اس لیے کہ لغت ایسے شخص کے لیے بھی ہے، جس کو مرادف لفظ کے بھی معنی معلوم نہیں۔

اس بنا پر بہتر طریقہ یہ ہے کہ لفظ کے معنی کی ایسی تشریح ہو جس سے اس کا پورا پورا مفہوم واضح ہو جائے۔ گویا اس کی تشریح معنی کی ہو، ہو تصویر ہو، یہ عمل کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ بادی النظر میں نہیں ہو سکتا۔ بس یوں سمجھیے کہ زبان میں مستعمل ہزاروں لفظوں کے مختلف معانی، جن کی تعداد لفظوں سے متجاوز ہو جائے گی، کی ایسی تصویر کشی ہو کہ اصل اور تصویر میں کسی

طرح کا فرق باقی نہ رہے، لغت نویس کے بس کی بات نہیں ہو سکتی، اس پر مستزاد یہ کہ بسا اوقات مختلف معانی میں بنیادی فرق نہیں ہوتا، ذرا ذرا سا فرق معنی استعمال کے طریقے کے اعتبار سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے ایسے باریک فرق کو الفاظ کے ذریعے واضح کرنے میں کتنی دشواریاں ہوں گی، ان کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ لغت نویس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ قدیم معانی کی بھی نشان دہی کر دے، اس طرح اس کا دُہرا کام ہو گیا۔ اُن الفاظ کی بھی نشان دہی کرے جو اَب متروک ہیں اور مستعمل الفاظ کے متروک معنی کی بھی، بلکہ وہ معنی بھی جن کا استعمال شاذ ہو۔ بہر حال اس دُشواری کا سامنا ہر زبان کے لغت نویس کو کرنا پڑتا ہے، لیکن چونکہ بعض زبانوں میں اس سلسلے کے مسائل حل ہو چکے ہیں، اس لیے لغت نویس کو تھوڑے سے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے، لیکن اُردو کے بیشتر مسائل ہنوز ابتدائی مراحل میں ہیں، اس بنا پر اُردو میں لغت نگاری کا کام نہایت دُشوار ہے۔

معانی کے شواہد: اُردو لغت نگاری کا یہ پہلو بھی بہت کمزور ہے، اس لیے کہ بعض لغات شواہد سے خالی ہیں اور جن میں شواہد آئے ہیں وہ اکثر ان الفاظ و فقرات کے ہیں جن کی شعری شہادت موجود ہے، نثری ادب یا کسی اور طرح کی تحریر کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ اسی بنا پر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے لغات شعری لغات ہیں، اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ مشہور اور متداول الفاظ کے علاوہ جن الفاظ کے معانی کی توضیح کے لیے شواہد نہ ہوں، ان کا معاملہ مشتبہ ہے۔ اُردو میں ایسے ہزاروں معانی ملیں گے جن کے لیے کوئی ثبوت نہیں۔ اس نقص کا دور کرنا آسان نہیں، اس کا فیصلہ سارے متون کے دقیق مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اور متون بھی وہ جو ہر طرح کے سقم سے پاک ہوں، تو اس سلسلے میں کئی اہم کام کرنے کے ہیں۔ اوّل گم شدہ متون کی بازیافت کی کوشش، دوم سارے متون کی تصحیح، آخر میں ہر کتاب سے الفاظ کا انتخاب اور ان کے معانی کا تعین، گویا گیسوے اُردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے۔

مرکبات کی تدوین و تلقین: لغت نگاری کا کام اس وقت تک معیاری طور پر انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ مرکبات کے سلسلے کے مطالعے مکمل نہ ہو جائیں، اور اس ضمن کا ہر مطالعہ ضخیم تصنیف کا متقاضی ہے۔ مرکبات کے سلسلے میں مسائل یہ ہیں:

۱۔ تلمیحات کی جمع آوری: اُردو ادب میں ہزاروں تلمیحات کا استعمال ہوا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی اس سلسلے کے مطالعے نہایت ناقص ہیں۔ الگ الگ شعرا کے استعمال شدہ تلمیحات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تک ملی ہے، اس سے اس موضوع کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اصل میں یہ موضوع بھی خاصا مشکل اور صبر آزما ہے۔ اُردو میں تلمیحات عربی، فارسی، سنسکرت، قدیم ایرانی، قدیم عربی، ترکی، یونانی، چینی، مصری وغیرہ ذرائع سے آئیں، ان سب کا قرار واقعی احاطہ نہایت مشکل کام ہے جو ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ راقم حروف نے چند سال ہوئے قدیم ایرانی اور زرتشتی ماخذ کی بعض اُردو تلمیحات جمع کیں تو وہ خاصی تعداد میں اکٹھا ہو گئیں۔ بہرحال یہ موضوع صبر آزما مطالعہ چاہتا ہے۔

۲۔ اُردو میں شعری تشبیہات و استعارات: اردو ادب میں فارسی کی تمام تشبیہات و استعارات کے علاوہ خود ہندستان سے اس بارے میں کافی استفادہ ہوا ہے۔ اس موضوع پر ابھی کوئی عالمانہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ ایسی صورت میں لغت نویس سے اس سلسلے کی مختتم بات کی توقع بجا نہ ہوگی۔ اس موضوع کی وسعت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ فارسی میں صرف چشم کی صفات و تشبیہات کی فہرست درج کی جاتی ہے:

آہو، آہو بچہ، آہو فریب، آہو گیر، آہو انداز، زنبور سرخ، شہباز، تیز چنگ، گیرا، سیر شکار، فرشتہ شکار، ترک، ترک خطائی، ترک مردم شکار، تیر انداز، کماندار، ترکش بند، تیر، تیغ، تیر ہوائی، تیغ کشیدہ، کمان کشیدہ، ناوک افگن، خدنگ افگن، بدخوی، بلاجوی، عربدہ جوی، کینہ جوی، جفا کش، عیار، جگردار، دنبالہ دار، بی باک، بیرحم، بی پروا، بی پروا نگاہ، بی نماز، کافر، فرعون،

نمرود، ضحاک، مردم آزار، مردم در، مردم کُش، عاشق کُش، بے گناہ کُش، خون ریز، خونخوار، قاتل، قتال، ظالم، ظالم خونخوار، ظالم مظلوم نما، غارت گر، ستم دستگاہ، ستم گر، شور انگیز، قیامت زاری، بازی کوش، شعبدہ باز، کرشمہ ساز، اختر، ستارہ، جادو، ہاروت، چاہ بابل، جادوانہ، جادووش، جادو فریب، جنوں فزائی، فسوں ساز، پرکار، پرفن، غمزہ زن، عشوہ فروش، کرشمہ پرداز، خانہ پرداز، فتنہ دکان، فتنہ، فتان، فتنہ گر، فتنہ ساز، فتنہ جو، فتنہ زا، فتنہ خیز، فتنہ انگیز، بیگانہ خو، آشنارو، وحشت دستگاہ، خانہ سیاہ، دل سیاہ، سیہ دل، سیہ خانہ، سرمہ رنگ، سرمہ بیز، سرمہ سا، سرمہ دار، سرمہ فریب، سرمہ پالا، مست، سیہ مست، نیم مست، مست خواب، خراب، مستانہ، غضب مست، خمار، میخانہ، مخمور، پرخمار، می گوں، می پرست، بادہ پیما، ساقی، مشرب، پیمانہ، ساغر، شیشہ، بادام، بادام سیہ، بادام تلخ، مہر بادامی، تنگ، تنگ ظرف، کشادہ، پریشان نظر، کوتہ نظر، پریشان نگاہ، شرزہ جنگ، ہرزہ گرد، روشن دل، روشن دماغ، دلبر، دلفریب، دلآویز، دل آشوب، خوش دنبالہ، خوش مژہ، خوش مژگاں، خوش نگاہ، خوش سخن، سخن دان، سخن ساز، سخن گو، کم حرف، سخن ور، گویا، نکتہ دار، تغافل شعار، شرمگیں، شرم آلود، شرمناک، حجاب آلود، طومار حیا، طومار سر بمہر حیا، گلگوں، شفق نگار، نرگس، نرگس سیراب، نرگس طناز، نرگس بیمار، نرگس گویا، نرگس شہلا، نرگس مستانہ، نرگس کافر مژہ، نرگس خواب آلود، نرگس پرخواب، نرگس بسیار خواب، نرگس فتنہ زا، نرگس لالہ رنگ، خوابناک، خواب آلود، گراں خواب، پرخواب، نیم خواب، نیم باز، بخواب رفتہ، گوشہ نشین، دردناک، ناتواں، بیمار وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ محاورات وضرب الامثال: اس موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسائل نکلے ہیں، مگر یہ موضوع بھی سیر حاصل مطالعے کا محتاج ہے۔ ہمارے لغت میں محاورے کے سلسلے کی اکثر غلطیاں ملتی ہیں۔ دراصل محاورے میں لفظ کا استعمال مجازی ہوتا ہے، اگر وہ اصلی معنی میں استعمال ہو تو محاورہ نہیں بنتا۔ مثلاً دفن کرنا راز کے ساتھ تو محاورہ ہے، لیکن مردے کے ساتھ محاورہ نہیں ہے۔ ضرب الامثال محاورے سے الگ ہے۔ اس کی شناخت آسان ہے،

لیکن سارے ضرب الامثال کو جمع کرنے کی طرف کوئی خاطر خواہ اقدام اب تک نہیں ہوا ہے۔ فارسی کے سیکڑوں ضرب الامثال اُردو میں برابر استعمال ہوئے ہیں، اور ایران میں فارسی ضرب الامثال پر جو کتاب ہے وہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعے سے موضوع کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ اُردو روزمرّہ کی جمع آوری: روزمرّہ لفظوں کے مخصوص طریق استعمال کو کہتے ہیں۔ مثلاً سارے آدمی دو دو چار چار کر کے چلے گئے، یا پانچ سات آدمی آئے ہوں گے۔ روزمرّوں کو بھی اکٹھا کرنا چاہیے تاکہ لوگ ان سے بجا طور پر استفادہ کریں۔ روزمرّہ کے صحیح استعمال سے زبان معیاری ہوتی ہے۔

۵۔ اصطلاحاتِ پیشہ وران: اُردو زبان میں پیشہ وران کی کافی اصطلاحات ملتی ہیں، لیکن ابھی اس سلسلے کا کام قابلِ توجہ حد تک انجام نہیں دیا جا سکا ہے۔ لکھنؤ کے اطراف کے لغات میں پتنگ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی وغیرہ کی اصطلاحیں کافی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ مگر درزی، بڑھئی، لہار، کاشت کار، کاریگر، موچی، سوداگر، میوہ فروش، سبزی فروش، بزاز وغیرہ پیشہ وروں کی اصطلاحوں سے لغات خالی ہیں۔ کشتی کے فن سے متعلق اصطلاحیں اُردو میں خال خال پائی جاتی ہیں، مگر اُردو لغات ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ دراصل یہ موضوع ہی وسیع اور دلچسپ ہے۔ پیشہ وروں کی زبان کا مطالعہ فن لسانیات وصوتیات کے لیے اہم مواد فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب کرخنداری اُردو قابلِ ذکر ہے۔

یہ موضوعات لغات کے لیے بھی سودمند مواد کے حامل ہیں، لیکن بنیادی کام نہ ہونے کی وجہ سے اُردو لغات ان سے استفادہ نہیں کر سکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف پیشہ وروں کی اصطلاحات پر مبنی الگ الگ رسالے کی ضرورت ہے اور کوئی لغت ان ساری اصطلاحوں کو شامل نہیں کر سکتا، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہر زبان کے کامل لغات متداول اور مشہور اصطلاحات کے حامل ہوتے ہیں۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو لغت نگاری کا مواد ابھی منتشر شکل

ہیں پایا جاتا ہے اور جب تک وہ مواد اکٹھا نہیں ہوتا اور ان پر الگ الگ عمیق مطالعے نہیں ہوجاتے قابلِ توجہ اور معتبر اُردو لغت کا تصوّر صحیح نہیں ہوگا۔ لغت سے لغت تیار کرنا یا شعری لغت ترتیب دینا لغت نگاری کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ دراصل یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ایک اور چند آدمی تھوڑے سے وقت میں اُردو کا وقیع لغت تیار کر سکتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اس فن کی غیر معمولی وسعت کا تقاضا ہے کہ اس کی تیاری میں ملک کے بہترین لوگوں کا تعاون حاصل ہو۔ پھر جو کام ایک مدت کے بعد تیار ہوگا' اس پر بار بار نظرِ ثانی' حک و اضافہ، ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رہے گا؛ اُردو کے لیے مزید اس بات کی ضرورت ہے کہ اس پر اقدام سے قبل بہت سے کام انجام دینے ہوں گے جن میں سے متون کی بازیافت' سارے متون کی تصحیح پھر ان کے دقیق مطالعے سے الفاظ و فقرات وغیرہ کا انتخاب اور ان کے معانی کا تعین۔ یہ متون صرف ادب تک محدود نہ ہوں گے۔ اس زبان میں جو جو چیزیں شائع ہوئی ہیں' وہ ساری کی ساری اسی طرح عمیق مطالعے میں آئیں گی' ان کے ساتھ ساتھ الگ الگ کتابوں کی فرہنگیں تیار ہوں گی' پھر ان کی مدد سے ایک ضخیم لغت تیار کیا جائے گا جس کی مدد سے ادب، زبان، معاشرت، تہذیب وغیرہ کے مسائل سمجھے اور پرکھے جاسکیں گے۔

پروفیسر سید حسن

لغت نویسی

حالی نے "یادگارِ غالب" میں بیان کیا ہے کہ ایامِ غدر کے ہنگامۂ گیر و دار میں مرزا غالب اپنے گھر میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، ان دنوں ان کے پاس محمد حسین تبریزی کی فرہنگ برہان قاطع کا ایک نسخہ اور ایک نسخہ دساطیر کا موجود تھا۔ مرزا برہان قاطع کا مطالعہ کرنے لگے تو اُنھیں اس میں بے ربطی نظر آئی، غور سے دیکھنے پر اکثر لغات کی تعریف غلط پائی اور طریقۂ بیان کو لغت نگاری کے خلاف پایا۔ اُنھوں نے اپنے اعتراضات یادداشت کی صورت میں قلمبند کر لیے اور ان سے ایک کتاب مرتب ہو گئی جس کا نام قاطع برہان رکھا گیا۔ یہ کتاب ۱۸۶۲ء میں طبع ہو کر اشاعت پذیر ہوئی۔ قاطع برہان جب اہلِ نظر کے ہاتھوں میں پہنچی تو بعض حق پسندوں نے غالب کے اعتراضات کے جواب لکھے، پھر تو غالب کے طرف داروں اور برہان قاطع کے مویدین کے مابین ایک جنگ سی جاری ہو گئی اور جواب الجواب کا جو سلسلہ ایک علمی مشاجرہ کی صورت میں عرصہ دراز تک چلتا رہا، اس سے سب غالب شناسوں کو واقفیت ہے۔ غالب کا خاص اعتراض یہ تھا کہ مولف برہان قاطع نے اپنی فرہنگ میں ایسے لغات داخل کر دیے ہیں جو فارسی زبان میں کبھی استعمال

نہیں ہوئے، اور بہت سے الفاظ کی تعریف وتشریح بھی غلط طور پر کی ہے، لیکن اعتراضات بیان کرتے میں غالب نے جو تمسخرانہ وتحقیر آمیز لب ولہجہ اختیار کیا وہ بہت ہی نامناسب تھا، غالب کی کمزوری یہ تھی کہ انھوں نے دوسری فرہنگوں سے مراجعہ کیے بغیر محض اپنی فارسی دانی کے زعم میں اور حافظے کی مدد سے اعتراضات کی فہرست تیار کرلی تھی اور اسے اپنا زبردست تحقیقی کارنامہ بناکر پیش کیا تھا۔ برہان قاطع کے مویدین نے فرہنگِ جہانگیری، فرہنگِ سروری اور فرہنگِ رشیدی کے حوالے دے کر غالب کے اعتراضات کو لغو قرار دیا، اس پر غالب نے تینوں نامبردہ فرہنگوں اور غیاث اللغات کو مستند ماننے سے ہی انکار کردیا اور ایک خود ساختہ نظریہ پیش کیا کہ کوئی ہندستانی فارسی لغت لکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ محمد حسین تبریزی کے ساتھ ساتھ فرہنگِ جہانگیری، فرہنگِ سروری، فرہنگ رشیدی اور غیاث اللغات کے مولفین کو بھی استہزا کا نشانہ بنایا۔ غالب نے برہان قاطع پر جو اعتراضات کیے تھے وہ اکثر درست ہیں، بعد کے فرہنگ نویسوں نے بھی غالب کی حمایت کی ہے، صاحبِ فرہنگ برہان جامع نے برہان قاطع پر اعتراضات کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں کنایات کو بھی لغت قرار دیا گیا ہے۔ سریانی، عبرانی، زند یا زند کے غیر مستعمل الفاظ داخل کردیے گئے ہیں اور لفظوں کی تحریف وتصحیف سے جو مختلف صورتیں پیدا ہوئی ہیں انھیں مستقل لفظ سمجھ کر ایک ایک لفظ کو کئی بار داخل کرلیا ہے۔ فرہنگ انجمن آرائے ناصری کے مولف رضا قلی خاں ہدایت نے بھی مذکورہ بالا سارے قدیم فرہنگوں کی لغزشوں اور فرد گزاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور خصوصاً برہان قاطع کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں لغات کے معنی شواہد و اسناد کے بغیر لکھے گئے ہیں۔ لہٰذا اس فرہنگ پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

برہان قاطع پر اعتراضات اور رد اعتراضات کی وجہ سے جو معرکہ آرائی ہوئی اس سے فارسی میں واژہ شناسی اور لسانی تحقیق میں ترقی ہوئی اور اس سے یہ اندازہ ہوا کہ فرہنگ نویسوں سے کیسی اور کتنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، حالانکہ انھوں نے الفاظ کی جمع آوری اور ان کے معنی متعین کرنے میں بڑا وقت اور محنت صرف کی۔ آہنگ جہانگیری کی تدوین بارہ برس کے عرصے میں مکمل

ہوئی۔ ۱۰۰۵ھ میں کام شروع ہوا تھا اور ۱۰۱۷ھ میں اختتام پذیر ہوا، اس کے مولف جمال الدین حسین انجو شیرازی نے جس محنت، تلاش اور تجسس سے کام لیا اس کا حال اس فرہنگ کے مقدمے میں اس طرح بیان کیا ہے:

"میں نے چوالیس فرہنگوں کا مطالعہ کیا (مقدمے میں ان سب فرہنگوں کے نام لکھے ہیں جن کا یہاں اعادہ باعث تطویل ہوگا) ان کے علاوہ نو ایسی فرہنگیں دیکھیں جن کے نہ تو نام معلوم ہیں اور نہ ان کے مولفین کا کوئی پتا ہے۔ تفسیر اور تاریخ، زند اور پازند اور دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ نظم کی کتابیں اور شاعروں کے دیوان بھی دیکھے جن کے اشعار اس فرہنگ میں تمثیل کے لیے نقل ہوئے ہیں، جو کتابیں ایّام قدیم میں تصنیف ہوئی ہیں ان کے اکثر الفاظ کی شرح فارسی قدیم میں کی ہے، مثلاً تفسیر زاہدی میں صابئین کی تفسیر میں "نغوشاک" لکھا ہے، پس میں نے تفسیر حسینی اور تفسیر کبیر میں نگاہ کی کہ صابئین کے کیا معنی درج ہیں اور اسی معنی کو "نغوشاک" کے ذیل میں درج کیا۔ اسی طرح جو الفاظ شکاری جانوروں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی 'بازنامہ' سے تصحیح کی، چنانچہ بعض فرہنگوں خصوصاً محمد بن ہندوشاہ کی فرہنگ میں دیکھا کہ 'خشین' کے معنی لکھا ہے کہ باز کا رنگ، نہ سرخ نہ سفید اور نہ سبز، لیکن اس عبارت سے مجھے اطمینان نہیں ہوا اور میں نے 'بازنامہ' سے رجوع کیا اور جو کچھ وہاں لکھا تھا اسے درج کیا، اسی طرح جو الفاظ بیماریوں اور دواؤں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تشریح کے لیے میں نے ذخیرۂ خوارزمشاہی اور اختیارات بدیعی سے مدد لی، اور جن لفظوں کا تعلق ملکوں، دیسوں، قصبوں اور دیہاتوں سے تھا، ان کے لیے میں نے نزہت القلوب اور عجائب البلدان کی طرف رجوع کیا، ان کتابوں کے ذریعے بہت سے الفاظ کی تصحیح ہوئی جن کی تحقیق میں فرہنگوں کے مولفین نے سہل انگاری کی تھی، بہت سے ایسے الفاظ بھی کتابوں میں ملے جن کا کسی فرہنگ میں نشان نہ تھا۔ ان کے حل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ان علاقوں کے لوگوں سے تحقیق کروں، جہاں کا مصنف یا شاعر باشندہ تھا یا جہاں اس کی سکونت تھی، مثلاً جو الفاظ حدیقہ اور دیوان سنائی میں ملے ان کی تحقیق میں نے

کابل اور غزنین کے لوگوں سے کی۔ اور جو الفاظ حکیم ناصر خسرو کے دیوان اور سفر نامے میں پائے گئے ان کے لیے خراسانیوں اور بدخشانیوں سے پوچھ گچھ کی اور ان کی سند شعرائے فصیح کے کلام سے لکھی"۔

فرہنگ سروری (یا مجمع الفرس) بھی بہت چھان بین کے بعد مرتب ہوئی۔ اس کے مولف محمد بن قاسم بن حاجی محمد کاشانی نے پہلی مرتبہ اسے ۱۰۰۸ء میں تالیف کیا، بیس سال بعد پھر نظر ثانی کی، نئے مطالعے و ماخذ سے الفاظ کی تعداد میں اضافہ کیا اور معنی و مفہوم کی بھی بہتر طریقے پر تشریح کی، اساتذہ کے کلام و تالیفات سے کثیر تعداد میں شواہد و اسناد درج کیے، لیکن جب ۱۰۶۴ھ میں فرہنگ رشیدی تالیف ہوئی تو اس کے مولف عبدالرشید بن عبدالغفور الحسینی المدنی المتوفی نے فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ سروری پر سخت تنقید کی اور ان کے اشتباہات و اغلاط کی نشاندہی کر کے فرہنگ کو ان سے پاک رکھا۔

یہاں پر فرہنگ نویسی کے سلسلے میں ایک واقعے کو بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ ۱۰۲۳ھ میں تقی اوحدی (صاحب "تذکرہ عرفات العاشقین) نے ایک فرہنگ بنام سرمۂ سلیمانی مرتب کی، جس میں اس نے فرہنگ سروری سے اخذ کر کے وہ الفاظ درج کیے جو مشکل و قدرے غیر متعارف تھے، لیکن شواہد و اسناد کو خارج کر دیا، چنانچہ وہ خود سرمۂ سلیمانی کے مقدمے میں لکھتا ہے:

"بعد از عبور و مرور بر نسخ متداولۂ متعارفہ و کتب مبسوط و مشروحۂ ارباب لغت وغیرہ نجاطر کسیر پُر تقصیر رسا مید کہ لغات مشکلہ غیر متارفہ مشایعہ فرس را ور سلک بیان آورد و آز آں مختصری سازد و مقید نہ بر نہجی متتبعان سابقہ و الا حقہ فرمودہ اندبل بہ نحوی جامع و مانع کہ حقیقت خیر الکلام ماقل ودل، بہ احسن وجہی از ناصیۂ ورود نش اور و ظہور رسا بندچہ اشارات متقدمین از فوائد و زواید پیراستہ و افادات متاخرین بزوائید فوائد آراستہ است و خلعت اختصاص خیر الامور او سطہا کہ اسناد قدر تش طراز ندہ دور بر ایں کلام برازندہ است سزاوار روش بر شاہد بیان ہیچ یک نیامد"۔

منقولہ بالا عبارت کا بطور خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ "میں نے لغت نگاروں کے

مشہور متداول نسخوں کے مطالعے کے بعد ان کی روش کے خلاف مشکل و غیر متعارف الفاظ پر مشتمل ایک مختصر سی فرہنگ مرتب کی ہے، متقدمین و متاخرین کی تالیفات میں غیر ضروری باتیں ہیں جن کی وجہ سے خیر الامور اوا سطہا کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا۔

جب سرمۂ سلیمانی مرتب ہوئی تو سروری زندہ تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا اور تقی اوحدی سے جھگڑنے لگا۔ یہاں تک کہ حاکم اصفہان کے پاس جاکر سرمۂ سلیمانی کے مولف کے خلاف نالش کی، حاکم کو ایسے مقدمے پر سخت تعجب ہوا۔ اس نے سروری سے سوال کیا کہ کیا تقی اوحدی نے تمھاری کتاب سے اقتباس کر لیا ہے۔ سروری نے جواب دیا نہیں اس نے میرے الفاظ اپنی تالیف میں داخل کر لیے ہیں۔ حاکم نے پھر سوال کیا کہ کیا یہ الفاظ تم نے وضع کیے ہیں۔ سروری نے نفی میں جواب دیا۔ حاکم نے کہا پھر شکایت کس بات کی ہے، جہاں سے تم نے وہ الفاظ جمع کیے ہیں تقی نے بھی وہیں سے گرد آوری کی ہے۔ پھر ہنس کر مقدمہ خارج کر دیا۔ اوپر کے سارے بیانات کا حاصل یہ ہے کہ لغت نگاری ایک امر مہم ہے۔ مولف کی محنت، تلاش اور کوشش کے باوجود اس میں اشتباہات و اغلاط کا راہ پاجانا یقینی ہے، خصوصاً وہ لغت جو فرد واحد کی کوشش سے تیار ہوتی ہے اس میں غلطیوں کے ارتکاب کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ میں نے اب جن فرہنگوں کا نام لیا ہے وہ سب انفرادی کوششوں کی پیداوار ہیں، ان سب پر تنقید ہوئی ہے اور ان کے عیوب و اشتباہات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی فرد واحد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی زبان کے تمام الفاظ و محاورات کے منابع و مفاہیم اور تعریف و تشریح سے کما حقہٗ واقفیت کا حامل ہوگا ایک فعل عبث ہے۔ تقریباً چالیس سال قبل ایران میں اسکول کے ایک معلم حبیب اللہ آموزگار نے ایک فرہنگ بنام فرہنگ آموزگار تالیف کی۔ اس فرہنگ کے خلاف رسالوں میں مضامین شائع ہوئے اور اس کے اغلاط کو بیان کر کے اسے غیر مستند قرار دے دیا گیا۔

اردو کی قدیم فرہنگیں خاص نقطۂ نظر کے ماتحت لکھی گئی تھیں۔ محمد بن قوام کرخی

کی لغت بحر الفضائل فی منافع الافاضل میں اور مرزا محمد بن فخرالدین کی فرہنگ تحفۃ الہند میں شامل ہے، اسی امر کی مثالیں ہیں۔ اس وقت ہندستان میں فارسی کا رواج اور اُردو زبان کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ان لغتوں میں اُردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں تاکہ فارسی جاننے والوں کو مقامی زبان سمجھنے میں آسانی ہو، جس طرح ایران میں اسدی طوسی نے لغت فرس تالیف کی۔ اسدی طوسی کے زمانے میں قدیم خراسانی شعرا کے کلام میں پہلوی زبان کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ عراق عجم کے قارئین کے لیے نامانوس تھے کیوں کہ اس خطے میں فارسی پر عربی زبان کا بہت زیادہ اثر قائم ہو چکا تھا' ہندستان پر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا پورے طور پر تسلط ہو گیا اور اس کے یورپی عملے ملک بھیل گئے تو ان کو ہندستانی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اسی حاجت کے پیشِ نظر یورپین مولفین نے فرہنگیں تالیف کیں، ڈاکٹر ہنیری ہیرسن، کپتان جوزف ٹیکر، کپتان ٹامس ٹیکر، جان شیکسپیر، ڈنکن فاربس وغیرہم نے ہندستانی، انگریزی لغات تیار کیے۔ فرانسوا دیلونکل نے ہندستانی فرانسیسی اور کیگن نے ہندستانی لاطینی انگریزی لغت تالیف کی۔ یہ سب فرہنگیں سوداگروں اور کمپنی کے عہدے داروں کو ہندستانی (اُردو) سیکھے سکھانے کی غرض سے مرتب کی گئیں۔ اردو کی باضابطہ فرہنگیں امیر مینائی کی امیر اللغات، فیروز الدین کی فیروز اللغات اور مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگِ آصفیہ ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبولیت و شہرت فرہنگ آصفیہ کو نصیب ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر ترقی اُردو بورڈ دہلی نے اس کا عکسی اڈیشن بڑے اہتمام سے شائع کیا، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے لغت نگاری کی انفرادی کوشش کا نتیجہ اکثر عیب دار ہوتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں اغلاط، اشتباہات اور تسامحات کی کثرت ہے، ملک کے مشہور محقق قاضی عبدالودود نے ان غلطیوں اور فروگذاشتوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے جو بالاقساط خدا بخش لائبریری جرنل میں شائع ہو رہی ہے۔ اس فہرست کو دیکھنے سے تعجب ہوتا ہے کہ کسی ذی علم شخص سے بقید ہوش و حواس ایسی غلطیاں کیوں کر سرزد

ہوسکتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں اُردو کی لغت مرتب کرنے کی انفرادی کوشش مولف مہذب اللغات نے کی ہے، اس کی اب تک متعدد جلدیں شائع ہوچکی ہیں، جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اغلاط کے علاوہ بہت سے سنسکرت الفاظ درج ہیں جو اُردو میں کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کو اُردو ہندی ہندستانی مسئلے کی تاریخ کا علم ہے انھیں یاد ہوگا کہ مرحوم ڈاکٹر عبدالحق اور سورگیہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے مابین ہندستانی زبان کو جو فارسی وناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے، قومی زبان قرار دینے کا فیصلہ ہوا تو ہندستانی زبان کی ایک لغت مرتب کرنے کی تجویز بھی منظور ہوئی جس میں وہ سارے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ جو جامع اللغات میں موجود ہیں اور وہ سارے اردو فارسی کلمات جو شبدھ ساگر میں درج ہیں شامل کیے جائیں۔ اس کے علاوہ اسکولوں میں پڑھائے جانے والے علوم کے مصطلحات ہندستانی زبان میں تیار کرنے کی تجویز بھی منظور کی گئی اور یہ سب کام ہندستانی کمیٹی کے سپرد کیا گیا، جس کا صدر دفتر پٹنہ میں قائم کیا گیا، مصطلحات تیار کرنے کی کئی ذیلی کمیٹیاں بھی بنائی گئیں۔ ریاضیات کے اصطلاحات بنانے کی جو کمیٹی بنی اس کا ایک رکن راقم السطور بھی مقرر کیا گیا۔ ہندستانی ڈکشنری اور فہرست مصطلحات مرتب کرنے کا کام عرصہ دراز تک جاری رہا۔ پھر ملک تقسیم ہوکر آزاد ہوا اور ملک کی قومی زبان خالص ہندی بخط ناگری قرار پائی تو ہندستانی زبان کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کردیا گیا۔ ہندستانی کمیٹی نے جتنا بھی کام انجام دیا تھا اسے سمیٹنے اور تہ کردینے کے واسطے بہار ٹکسٹ بک کمیٹی کو ذمے دار بنایا گیا اور اس غرض سے ٹکسٹ بک کمیٹی نے ایک الگ شعبہ بناکر ایک اڈیشنل سکریٹری کو اس شعبے کا انچارج مقرر کیا۔ اس عہدے پر راقم السطور نے بھی پٹنہ کالج میں لکچررشپ کے ساتھ ساتھ تقریباً دو سال تک کام کیا تھا، جب ہندستانی کمیٹی کا سب کام سمیٹ کر خاتمے تک پہنچادیا گیا تو یہ عہدہ بھی ختم کردیا گیا۔ ہندستانی ڈکشنری مرتب کرنے کے سلسلے میں بہت سا کام باوا کلر کی نگرانی میں انجام پاچکا تھا کئی ضخیم جلدوں

میں کئی ہزار الفاظ جمع کر لیے گئے تھے، ہندستانی کیٹی کے خاتمے پر وہ تمام جلدیں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے دفتر میں داخل کر دی گئی تھیں۔ تین چار سال کے بعد جب ان کی کسی سلسلے میں جستجو ہوئی تو کچھ پتا نہ لگا کہ وہ سب جلدیں کیا ہوئیں، افسوس کہ محنت سے جمع کیا ہوا ذخیرہ تلف ہو گیا۔

ہندستانی کیٹی کے متعلق راقم السطور نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے وہ جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل میں یہ لکھنا مقصود تھا کہ جامع اللغات میں جسے ہندستانی زبان کی لغت تیار کرنے میں اس قدر اہمیت دی گئی غلطیاں بھی ہیں اور اسی میں سنسکرت کے ایسے الفاظ بھی داخل کر دیے گئے ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں ہوئے۔ یہ لغت ایک انفرادی کوشش کی پیداوار ہے اور اس کی ترتیب میں شخصی فکر اور ذاتی تصور کا خاصا دخل ہے۔ در اصل جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے لغت نویسی کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے ایران میں آقائی حبیب اللہ آموزگار نے فارسی زبان کی ایک لغت بنام فرہنگ "آموزگار" تیار کی۔ اس لغت پر رسالوں اور اخباروں میں زبردست تنقید ہوئی اور اس کے اغلاط و اشتباہات بیان کر کے اسے غیر مستند اور ساقط الاعتبار قرار دیا گیا۔

سطور بالا میں ان لغتوں کے اوصاف تحریر ہوئے ہیں جن کا تعلق انفرادی وشخصی کوششوں سے ہے۔ اب ذرا ان لغتوں کا حال ملاحظہ فرمائیے جو کسی ادارے کی اجتماعی کوشش سے وجود میں آئی ہیں، یعنی جن کی تالیف میں ایک سے زیادہ ذی علم اصحاب کی کوششیں شامل رہی ہیں۔ یہاں صرف دو مثالوں کی طرف توجہ دینا کافی ہوگا۔ ایک مثال فارسی لغت نگاری کی ہے اور دوسری اردو اصطلاح سازی کی۔ آج سے تقریباً چالیس پینتالیس سال پہلے ایرانی حکومت نے فارسی کی ایک مبسوط و مشروح فرہنگ کی تدوین کی غرض سے فارسی کے ایک معروف و نامور ادیب و محقق آقا علی دہخدا کی نگرانی و سرکردگی میں ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں الفاظ کی گرد آوری،

ان کے معنی و مفہوم کو قلمبند کرنے اور ان کے استعمال کے متعلق اسناد و شواہد تلاش کرنے کے لیے متعدد ذی علم اشخاص مقرر کیے گئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں ایران میں تھا تو حکومت سے اجازت لے کر اس ادارے کو دیکھنے گیا تھا۔ بڑے سلیقے اور ضابطے کے ساتھ کام ہو رہا تھا، اگرچہ اس وقت آقای دہخدا کی وفات ہو چکی تھی اور ادارے کی سربراہی ڈاکٹر محمد معین استاد دانش گاہ تہران کو تفویض ہوئی تھی (ڈاکٹر محمد معین بھی مرحوم ہو چکے ہیں) اب تک اس فرہنگ کی جسے 'لغت نامہ' کا نام دیا گیا ہے، دو سے زائد جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس طوالت کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب صرف فرہنگ الفاظ نہیں رہی ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک دائرۃ المعارف کی ہوگئی ہے جس میں سیکڑوں اشخاص و مقامات کے نام درج ہو گئے ہیں، جن کے تاریخی و جغرافیائی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے پھیلے ہوئے کام میں اغلاط و اشتباہات کا راہ پاجانا تعجب کی بات نہیں، چنانچہ 'لغت نامہ' میں کثرت سے غلطیاں ملتی ہیں۔ تاج محل کو نور جہاں کا مقبرہ بتایا گیا ہے۔ الفاظ کے استعمال کے متعلق اسناد و شواہد کی غیر ضروری طوالت ملتی ہے بجائے اس کے کہ کسی لفظ کے استعمال کے لیے مختلف شعرا یا مصنفین کے کلام یا تحریر سے اسناد اخذ کیے جائیں اکثر ایک ہی شاعر یا مصنف کے متعدد اشعار یا عبارتیں نقل کر دی گئی ہیں۔

اب اردو کی مثال ملاحظہ فرمائیے۔ پاکستان میں ترقی اردو بورڈ کے ماتحت عرصہ دراز سے لغت مرتب کرنے کا کام ہو رہا ہے اور اس اہم خدمت میں متعدد ذی علم اشخاص مشغول ہیں۔ چند مہینے ہوئے اس لغت کی پہلی جلد تیار ہو کر بازار میں فروخت کے لیے آگئی ہے۔ اس کی قیمت تین سو روپے ہے۔ اخباروں میں خبر آئی ہے کہ لاہور میں کسی صاحب نے اس کا ایک نسخہ خریدا تھا، مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس میں متعدد غلطیاں ہیں۔ انھوں نے ادارے کے نگراں کے خلاف دعوا دائر کر دیا ہے کہ یہ کتاب ناقص ہے، اس سے کام والوں کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ کتاب کی قیمت واپس کر دی جائے۔ یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ترقی اردو بورڈ دہلی

کے ماتحت جو اُردو لغت مرتب ہو رہی ہے اس کے مرتبین کے لیے یہ مقدمہ سخت انتباہ ہے۔

غرض یہ کہ لغت نگاری کی کوشش چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کام میں اغلاط و اشتباہات سے بچنا دُشوار ہے۔ یہ کام بہت ہی محنت طلب ہے۔ بے انتہا تلاش و جستجو، تحقیق و تفتیش اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو لغت کی تیاری کے مسائل بہت ہی دُشوار اور پیچیدہ ہیں۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے اس میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت، پُرتگالی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ مقامی بولیوں کے بکثرت الفاظ شامل ہیں۔ اُردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کا علاقہ سارے ہندستان میں پھیلا ہوا ہے اور جن علاقوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے وہاں کے مقامی الفاظ بھی اس میں داخل ہو گئے ہیں، جس کی وجہ سے اس زبان میں زبردست وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اُردو کی جامع و مکمل لغت وہی ہو سکتی ہے جو ہر علاقے کے لوگوں کے لیے قابل استفادہ ہو، لہٰذا لغت مرتب کرنے والوں کی جماعت میں ہر علاقے کے ایسے باخبر اشخاص شامل ہونے چاہییں جو مختلف علاقوں کی بولیوں اور زبانوں سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔

اگرچہ ایشیا و یورپ کی بعض اہم زبانوں کی بہ نسبت اُردو کی عمر بہت مختصر ہے، لیکن ڈھائی سو سال کے عرصے میں اس نے تحول و تکامل کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اس کے الفاظ کے املا، معانی و مفاہیم اور استعمال میں تھوڑی تھوڑی مدت میں اہم تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اردو کی ایک مستند و مفصل لغت میں ان تبدیلیوں کی تاریخ و تشریح کرنا ہوگی، یعنی یہ بتانا ہوگا کہ کوئی لفظ کس زمانے میں کس طرح لکھا جاتا تھا اور اسے کس نے کس طرح استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام محنت طلب اور سخت صبر آزما ہے۔ اس کے لیے اُردو کی قدیم و جدید کتابوں کا وسیع مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے باوجود کہ جناب رشید حسن خاں صاحب اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

نے اُردو الفاظ کے املا کے لیے اپنی گراں قدر تالیفات میں دستور و قواعد مرتب کیے ہیں۔ ہنوز بعض الفاظ کے املا کا ملک گیر سطح پر تعین نہیں ہو سکا ہے مختلف علاقوں کے لوگ مختلف طریقے سے املا کرتے ہیں۔ لغت میں صحیح و معیاری املا درج کرنا ضروری ہوگا اور تلفظ کے لیے حرکات و سکنات استعمال کرنے ہوں گے۔ اگر ضرورت ہو تو ایک لفظ کا تلفظ کسی دوسرے ہم وزن و معلوم لفظ کے حوالے سے بتانا ہوگا' محاورات وضرب الامثال جُزوِ زبان ہوتے ہیں۔ لغت میں انھیں معنی و مطلب کے ساتھ شامل کرنا لازم ہے اور لغت کا ایک اہم باب مصطلحات پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہاں مصطلحات سے مراد صرف سائنس کے مصطلحات نہیں ہیں' بلکہ وہ مصطلحات بھی جو اُردو تہذیب کی نمایندگی کرتے ہیں وہ مصطلحات جو پرانے کھیل تماشوں اور پیشوں سے متعلق ہیں یا جن کا تعلق گزشتہ دو تین صدی کے طرزِ معاشرت سے ہے' فی زمانہ اکثر پرانے کھیل تماشے متروک ہو چکے ہیں بہت سے پیشے بھی اب مروّج نہیں رہے لیکن ان کی تمدنی اہمیت مسلّم ہے۔ گنجفہ' چوسر' پچیسی کے کھیل سے اب شاید ہی کوئی واقف ہو۔ بٹیر بازی اور مُرغ بازی کے رواج کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے' بھانڈوں کی نقلیں اب کہیں دیکھنے میں نہیں آتیں' طوائفوں کے کوٹھے ویران پڑے ہیں۔ کارواں سرائے اور بھٹیار خانے کے نام و نشان باقی نہیں ہیں' ان سب سے متعلق جو مصطلحات تھے انھیں لوگ بھولتے جا رہے ہیں' حالانکہ ان کا تعلق ہمارے تمدن کی تاریخ سے ہے' شادی بیاہ کے بہت سے رسوم اب متروک ہو گئے ہیں' عورتوں کے زیورات کو اب کوئی نہیں جانتا' یہی مردوں اور عورتوں کے پرانے لباس کا بھی ہے۔ پُرانے آلاتِ جنگ کو بھی اب کوئی نہیں پہچانتا۔ ان سب کے نام' مصطلحات کو اردو لغت میں جگہ دینی ہوگی' راقم السطور نے چند ماہ قبل رسالہ نیا دور لکھنؤ میں ایک مضمون بعنوان داستان امیر حمزہ کا لسانیاتی پہلو لکھا تھا جس میں اس داستان سے اخذ کر کے بہت سے الفاظ' ضرب الامثال اور مصطلحات کی فہرست شامل کر دی تھی۔

مرتبین لغت کا ایک اہم کام الفاظ کے مآخذ و منابع کی جستجو بھی ہے'

ان کی اصل وریشہ دریافت کرنا لسانیاتی تحقیق ہے، لیکن اس میں غلطی کرنے کا احتمال رہتا ہے۔ فرہنگ برہان قاطع کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ اس میں بعض الفاظ کی اصل بتانے میں غلطی کا ارتکاب ہوا ہے، بعض الفاظ کی ظاہری شکل وصورت سے دھوکا ہوتا ہے اور اس کی اصل غلط بتائی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک لفظ 'انجمن' ہے جسے لوگ عام طور پر لفظ انجم سے متعلق سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ لفظ دراصل قدیم فارسی زبان کا ہے اور اس کی قدیم شکل "ہم گمن" تھی جس کے معنی ہیں ساتھ مل کے جانا، لسانی اصول کے مطابق مرور ایام سے "ہمگمن" انجمن بن گیا ہے۔ اسی طرح لفظ یوم ہے، جسے عربی زبان کا لفظ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس زبان میں بھی مستعمل ہے، لیکن اصل میں یہ لفظ "آرامی" زبان کا ہے جو عربی کی طرح سامی الاصل ہے، راقم السطور نے ۱۹۵۰ء میں رسالہ نگار لکھنؤ میں ایک مقالہ لکھا تھا جس میں اُردو کے بعض الفاظ کے ماخذ و مناہج کی نشان دہی کی تھی۔

اس مضمون کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اردو کی ایسی لغت تالیف ہو جو ہر لحاظ سے جامع ومکمل ہو اور جس کی ترتیب وتیاری میں زیادہ سے زیادہ محنت صرف کی جائے اور حد درجہ احتیاط سے کام لیا جائے تاکہ کم سے کم غلطیاں سرزد ہوں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

اُردو اور ہندی کا رشتہ

اُردو اور ہندی کے رشتے کے بارے میں یہ سوال اکثر اُٹھایا جاتا ہے کہ اُردو اور ہندی ایک زبان ہیں یا دو زبانیں؟ بعض حضرات انھیں ایک زبان کے دو اسلوب بھی مانتے ہیں اور اسالیب کی اس تفریق کی ذمے داری نئی بورژوازی کے سر ڈالتے ہیں جس نے دونوں کے بولنے والوں کو الگ الگ اپنی لسانی میراث کا احساس دلایا، اور زبانوں کی راہیں الگ کردیں۔ وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ بعض چیزوں کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ دونوں زبانوں کی ثقافتی ترجیحات کے سرچشمے الگ الگ تھے، لیکن اس احساس کو شدید تر کیا برطانوی سامراج نے۔ اپنے مفاد اور اقتدار کے پیشِ نظر غیر ملکی سامراج نے کس طرح ہندستانی تہذیبی منطقوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کیا اور اس کا کتنا گہرا اثر ہندی اور اُردو کی تفریق پر پڑا، اس کا اندازہ آج مشکل نہیں۔ رہے جاگیرداری کے اثرات تو اُردو نے تو آنکھ ہی جاگیرداری عہد میں کھولی تھی، لیکن اردو کی نشو و نما صرف دربار سے متعلق نہیں رہی۔ خانقاہ اور بازار سے بھی اسے اتنا ہی ربط رہا ہے۔ اس عہد میں جو مشترک ہندستانی تہذیب کی فضا تیار ہو رہی تھی

اور جس میں مذہبی واجبات سے قطع نظر معاشرتی، جمالیاتی اور سماجی سطح پر مل جل کر رہنے کی ایک مشترک تہذیبی فضا تیار ہو رہی تھی، اس میں ترسیلی رابطے کے طور پر زبان سے تو سروکار تھا، اس کے ناموں سے مطلب نہیں تھا۔ اس زمانے میں اُردو کا ایک نام ہندی یا ہندوی بھی تھا۔ شمالی ہندستان کی یہ ریختہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے تاریخی اور تہذیبی سابقے سے وجود میں آئی تھی۔ صوفیوں، سنتوں، فقیروں اور تاجروں کے ذریعے جاگیرداری عہد ہی میں نہ صرف پورے شمال میں بلکہ جنوب میں گجرات اور دکن تک پھیل گئی تھی۔ ریختہ، ہندی، ہندوی کے علاوہ گجری، دکھنی، دہلوی، اُردو، اُردوے معلا، ہندستانی، سب اس ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے۔ تیرھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک پانچ صدیوں کے طویل جاگیرداری عہد میں ہندستانی زبان کے اس نہایت وسیع لسانی دھارے میں کسی طرح کے تفرقے یا تناز‏عے کا کوئی جزو محض نہیں ملتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اختلافات کا سلسلہ اس زمانے سے شروع ہوتا ہے جب انگریزی سامراج اپنے استحکام کے لیے ہندستان کی تہذیبی زندگی میں دست درازی شروع کرتا ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ عہد وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تہذیبی یگانگت، رواداری اور اتحاد پسندی و موانست کے رشتے نہایت استوار تھے اور اس کا اثر نوزائیدہ زبان کی تشکیل اور ہیئت پر بھی پڑ رہا تھا۔ ان رشتوں پر کاری ضرب برطانوی سامراج ہی نے لگائی جس کے ایک نہیں، سیکڑوں شواہد موجود ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے اپنی حکمت عملی کے نتیجے کے طور پر جب مذہب، ذات، برادری، فرقہ، نسل، علاقہ ہر حربے کو استعمال کیا، تو زبان تو سامنے کی چیز تھی اور تہذیبی، سماجی شیرازہ بندی کا اہم ترین رابطہ بھی تھی۔ چنانچہ اس کا زد میں آنا اور جھگڑے فساد کی جڑ بن جانا لازمی بات تھی۔ بہر حال اس کی ذمے داری جاگیرداری پر یا بورژوازی پر ڈالنا صحیح نہیں ہے۔

اُردو اور ہندی کے لسانی رشتے کے بارے میں میں بعض بنیادی باتیں اپنے مضمون مطبوعہ "آج کل"، نومبر ۸۲ء میں بیان کر چکا ہوں۔ اگر ان میں سے کچھ کی تکرار ہوگی بھی تو محض ضمناً۔ اصل مقصد اس بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف

اشارہ کرنا ہے۔ اُردو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ عام اندازے کے مطابق اُردو کے ستّر فی صد الفاظ پراکرتوں کے ذریعے سے آئے ہیں یعنی ہندی ہیں۔ باقی تقریباً تیس فی صد الفاظ عربی، فارسی، ترکی کے ہیں۔ ان مستعار الفاظ کی کل تعداد چودہ پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان لفظوں کو اُردو نے کس طرح اپنی خراد پر اتارا اور کس طرح انھیں اپنایا، اس تاریخی عمل کے بارے میں معلومات زیادہ نہیں۔ اس بحث کا ایک دل چسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ان لفظوں میں جو مخصوص آوازیں ہیں، اردو نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انھیں کس طرح اُردوایا اور ہندُستا بنایا۔ مثال کے طور پر اُردو کے ذخیرۂ مستعار میں ذ، ز، ض، ظ کی آوازیں اصل کی رو سے اپنی اپنی حیثیت رکھتی ہیں یعنی عربی میں ان چار حروف کی چار مختلف آوازیں ہیں۔ اُردو میں یہ سب آوازیں ایک ہوگئیں۔ اس طرح کا سلوک اُردو نے س، ث اور ص کے ساتھ بھی کیا ہے اور ان کا باہمی صوتی فرق بھی اُردو میں زائل ہوگیا ہے۔ ت اور ط، اور ح اور ہ کی آوازوں میں بھی اردو میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ سب کی سب آوازیں اُردو نے ہندستانی نہج پر اُتاری ہیں۔ عروض میں الف اور ع کے احکامات الگ الگ سہی لیکن عام تلفظ میں اُردو کے تمام مصوتے جو الف کے ساتھ لکھے جاتے ہیں وہ ع کے ساتھ بھی وارد ہوتے ہیں اور الف اور ع کا صوتی فرق نہ ہونے کے برابر ہے۔ چھوٹے مصوتوں کا معاملہ اس سے بھی دل چسپ ہے۔ مستعار لفظوں کے چھوٹے مصوتوں میں ایسی ایسی کایا پلٹ ہوئی ہے کہ باید و شاید۔ اصل ترکیب جِدّ و جہد ہے یعنی بالکسر اوّل لیکن عام طور پر جَدّ و جہد یعنی بالفتح اوّل بولا جاتا ہے۔ اصل لفظ رِفعت ہے بالکسر رے، لوگ رَفعت بالفتح رے بولتے ہیں۔ اصل اُسلوب ہے بالضمہ الف، اکثر و بیشتر لوگ اَسلوب کہتے ہیں یعنی بالفتح الف۔ یہی معاملہ حُضور اور بُزرگ کا ہے۔ اصل لفظ تجرِبہ ہے بسکون جیم و بالکسر رے جب کہ بالضمہ رے و بالفتح رے بھی سنائی دیتا ہے۔ اصل وِرثہ بالکسر واؤ تھا۔ اُردو میں بالفتح واؤ بولا جانے لگا۔ اصل، عقل اور دخل اکثر بہ حرکتِ دوم بولے جاتے ہیں اگرچہ محتاط گفتگو میں نہیں۔ لیکن محتاط سے محتاط اور بڑے سے بڑا پڑھا لکھا بھی غدر یا بدر کو جو اصلاً بسکون دال ہیں بہ حرکتِ وال

پڑھتا ہے یعنی غَدَر کی بات یا بَدَر صاحب البتہ اصل کا احترام ترکیب میں واجب ہو جاتا ہے یعنی بدرالدین طیب جی۔ غرض اسی طرح کی سیکڑوں مثالیں ہیں جن میں مصوتوں کی یا تو نوعیت بدل گئی ہے یا ان کا مقام بدل گیا ہے۔ یہ سب اردوانے کے ہندُستانی عمل کا کرشمہ ہے۔ ایسا گرامر میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً ہم امیر، وزیر، فقیر کی جمع امیروں، وزیروں اور فقیروں بھی بولتے ہیں اور ان کی مستعار جمع امرا، وزرا، اور فقرا بھی استعمال میں لاتے ہیں، لیکن ہر مستعار لفظ پر یہ دہرا قاعدہ لاگو نہیں ہوتا۔ مثلاً صندوق عربی لفظ ہے لیکن اس کی عربی جمع صناویق ہم کبھی استعمال نہیں کرتے اور ہمیشہ ہندی میں صندوقوں ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اسی طرح شمس عربی میں مونث ہے، اسے اردو میں ہندی سورج کی وضع پر مذکر بولا جاتا ہے۔ ہندیانے کے اس عمل کا اثر تلفظ اور گرامر کے علاوہ معنی کی تبدیلیوں پر بھی پڑا ہے۔ مثلاً عرصہ جگہ کے معنی میں تھا۔ جیسے عرصہ تنگ ہونا۔ داغ کا مشہور شعر ہے:

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

لیکن عام طور پر ہم عرصہ کو وقت اور مدّت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر کے اصل معنی حاکم یا سردار کے تھے اور غریب کے اجنبی کے۔ ہم ان لفظوں کو روپے پیسے والے اور مفلس کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گلاب گل کے عرق کے معنی میں تھا، خاص پھول کے لیے گل تھا، ہم نے اسے پھول کی پتیوں سے نچوڑے ہوئے عرق سے ہٹا کر پھول کے معنی عطا کر دیے۔ اب گلاب پھولوں کا بادشاہ ہے۔ اسی طرح مُرغ کوئی بھی پرندہ تھا، ہم نے اسے خاص پرندے سے منسوب کر دیا اور اس سے مرغا اور مرغی بھی بنا لیے۔ معنوی تبدیلیوں کا یہ عمل قدم قدم پر ملتا ہے۔ اصل لفظ مصالح تھا، اس سے مصالحہ بنا۔ صلح سے جو امن اور اچھائی کے معنی میں تھا، اُردو میں "مصالحہ" کھانوں میں کام آنے والے "مسالہ" کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح "تکلیف" کو ایرانی فرض اور ذمّے داری کے معنی میں بولتے ہیں۔ ہم زحمت

کے لیے استعمال کرتے ہیں "خفا" کے معنی گلا گھونٹنا ہیں۔ ہم ناراض ہونا کے لیے بولتے ہیں "ناخوشی" ہم ناراضی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن اہلِ ایران نے "ناخوشی" کو بیماری کے معنی دے دیے ہیں۔ اسی طرح "تیغ" ہمارے یہاں تلوار ہے اور ایران میں استرے کے معنی میں رہ گیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ہندستانی کانفرنس لکھنؤ کے خطبۂ صدارت میں صحیح فرمایا تھا:

"ان فارسی الفاظ سے جنھیں ہم فارسی سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، اہلِ ایران اُن پر چونکتے ہیں اور ہماری ہنسی اُڑاتے ہیں یعنی وہ الفاظ فارسی نہیں رہے۔ ہم نے اُردو میں ان کو دوسرے معنی دے دیے ہیں، اور اب وہ لفظ بالکل ہمارے ہو گئے ہیں۔ آپ ان کو اپنی زبان سے نکال دیجیے۔ آپ کے ہاں سے نکل کر وہ لفظ بالکل نکھرے ہو جائیں گے، کیوں کہ فارسی یا عربی ان معنوں میں انھیں قبول نہ کرے گی۔"

اس بارے میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربے سے ایک پُرلطف مثال "ظریف و متین" کی پیش کی۔ ظریف ہم اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق ہو یا خوش طبع ہو۔ متین ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ لیکن ایک ترکی اخبار میں انھوں نے ایک جوتا بیچنے والے کے اشتہارات دیکھے جو کہتا تھا اس کے جوتے "ظریف و متین" ہیں یعنی گویا یہ جوتے بیک وقت مذاق بھی کریں گے اور نہایت متانت سے بھی پیش آئیں گے۔ لیکن اشتہار دینے والے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ تو یہ اعلان کر رہا تھا کہ اس کے جوتے "ظریف" یعنی خوبصورت بھی ہیں اور "متین" یعنی مضبوط بھی۔

اُردو کا کمال یہ ہے کہ اس نے مستعار اور دیسی عناصر میں ایسا اعتدال پیدا کیا ہے کہ اس کی نظیر دوسری زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتی۔ مثلاً روزمرّہ ہی کو لے لیجیے۔ چشم بمعنی آنکھ اردو شاعری کی لفظیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے:

یہ جو چشمِ پُرآب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

چشمِ نرگس، چشمِ فسوں گر، یا کیفیتِ چشم عام ترکیبیں ہیں، لیکن اگر اُردو میں کہنا ہو "اس کی آنکھیں دُکھنے آئی ہیں" تو یہاں آنکھیں کی جگہ چشم استعمال نہیں ہوتا۔ اُردو اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ روزمرّہ کے خلاف ہے۔ اس لیے غلط ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر کے نحوی ڈھانچے میں چشم کے استعمال کا محل نہیں۔

دل کا کوئی قصور نہیں ہے آنکھیں اس سے لڑ پڑیاں
مار رکھا سو ان نے ہم کو کس ظالم سے جا لڑیاں

آتش آگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن "چولہے میں آتش جلادو" اُردو میں کہا ہی نہیں جا سکتا، اُردو روزمرّہ کی رو سے یہ غلطِ محض ہے۔ اُردو میں ہمیشہ چولہے میں آگ جلادو" ہی کہا جائے گا۔ اگر دیسی لفظ کا محل ہے تو دیسی لفظ ہی استعمال ہوگا، مستعار اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ اُردو کے لسانی تموّل اور پختگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ ذیل کے مصرعے ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ آگ کا لفظ استعمال ہوا ہے، دوسری جگہ آتش کا۔ ایک کی جگہ پر دوسرے کا استعمال ممکن ہی نہیں۔ یہ سلیقے، روزمرّہ، اور مذاقِ سلیم کے خلاف ہوگا:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے — اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

روشن جمالِ یار سے تھی انجمن تمام — دہکا ہوا تھا آتشِ گُل سے بدن تمام

ظاہر ہے اُردو مستعار اور دیسی لفظوں سے لامحالہ برابر کا سلوک کرتی ہے اور جہاں جس کا محل ہوتا ہے، اسے استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہندی میں تدبھو کو چھوڑ کر تت سم کی طرف پلٹنے کا جو رجحان پایا جاتا ہے یا پراکرتوں کی سادگی کو تج کر سنسکرت کی اجنبیت کی طرف رجوع کی جو کوشش ہے یا عربی فارسی کے رچے بسے لفظوں کو کھدیڑ کر جس طرح چن چن کر مترادفات سجائے جاتے ہیں، ان کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ زبان بوجھل بن جاتی ہے اور اپنی فطری سادگی اور روانی سے محروم ہو کر تصنّع کا شکار ہو جاتی ہے۔

اب ایک نظر رسم الخط پر ڈال لی جائے جس پر منگولوں کے ذریعے لائے جانے

یا بدیسی ہونے یا تفرقے کی بنیاد ہونے کے کیسے کیسے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ اُردو رسم الخط میں ۳۶ حروف ہیں۔ ان میں سے ۱۴ حروف کی آوازوں کی جو کایا پلٹ اُردو نے کی ہے، اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب ذرا آوازوں اور حروف کے اضافوں پر بھی نظر ڈال لیے۔ ہکار آوازیں عربی میں نہیں ہیں۔ بندشی آوازوں میں پورے ہکار سیٹ یعنی بھ، پھ، تھ، دھ، جھ، چھ، کھ، گھ کا اضافہ اردو میں پراکرتوں کی دین ہے۔ اسی طرح معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی ہندی اثرات کے تحت اضافہ ہوئے۔ یہ کل ۱۴ آوازیں ہیں۔ یعنی اُردو رسم الخط میں ایک تہائی سے بھی زیادہ آوازوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اُردو بولتے لکھتے ہوئے ان آوازوں سے مفر نہیں۔ لب و لہجہ، لفظوں کے بل اور سُر لہروں کا اضافہ اس پر مستزاد۔ غرض اس رسم الخط کی، جو ہم نے صدیوں پہلے اُردو کے لیے لیا تھا، اردوانے کے عمل کے دوران اتنی کایا پلٹ ہو چکی ہے کہ نہ صرف اس کی اصل آوازوں میں سے بہت سوں کو ہم نے بدل دیا ہے بلکہ اس میں ایسی ایسی آوازوں اور علامتوں کے اضافے بھی کیے ہیں جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو کا ایک صفحہ تو کیا ایک پیراگراف بھی ان آوازوں کے بغیر لکھا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر کسی اُردو کتاب یا اخبار کا ایک صفحہ بھی اگر ایرانی یا عرب کے سامنے رکھا جائے تو وہ اسے صحیح نہیں پڑھ سکے گا۔ ایسے رسم الخط کو جو قبولے جانے کے دوران تنسیخ و توسیع کے زبردست نامیاتی عمل سے گزر چکا ہے، اور نصف سے بھی زیادہ بدل چکا ہے، اس کو اب غیر ملکی کہنا اور اس کی بنا پر ہندی اور اردو کی خلیج کو وسیع کرنا کہاں کی انصاف پسندی اور دانشمندی ہے۔

یہ تو اردو کے مستعار سرمایے کی بحث ہے۔ اب ذرا ہندی کے مستعار سرمایے یعنی ان فارسی عربی لفظوں یا ان کے اجزا پر نظر ڈالی جائے جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہندی میں استعمال ہونے والے عربی فارسی کے الفاظ قدرتی طور پر وہ ہیں جو اردو میں کثیر الاستعمال ہیں اور کثرتِ استعمال ہی کی وجہ سے ہندی کے لیے ناگزیر ہو گئے ہیں۔ ہندی کی بنیادی لفظیات پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ BASIC VOCABULARY OF HINDI کے نام سے کیلاش چندر بھاٹیہ نے علی گڑھ

سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند نے بھی دو ہزار لفظوں کی BASIC HINDI VOCABULARY شائع کی ہے اور اس طرح کا کام سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ہندی سے بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ان تمام مطبوعات میں ہمارے نقطۂ نظر سے سیتارام شاستری کا ہندی میں استعمال ہونے والے عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا وہ سروے جو رسالہ ہندی میں شائع ہوا ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ایسے دو ہزار تین سو عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا اندراج ہے جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں عربی، فارسی لفظ کے سامنے اس کا سنسکرت مترادف بھی دے دیا گیا ہے، اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ہندی میں صرف چار سو پچاس عربی فارسی کے بنیادی لفظ ایسے ہیں جن کے متبادل فراہم نہیں کیے جاسکتے۔ باقی سب لفظوں کو بدلا جاسکتا ہے۔ جن لفظوں کے متبادل فراہم کیے گئے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہیں مثلاً "حضور" کے معنی "شریمان" یا "حویلی" کے معنی "بھون" درج کیے گئے ہیں، یہ غور کیے بغیر کہ ان لفظوں کے کچھ ثقافتی وسماجیاتی مفاہیم بھی ہوسکتے ہیں جو مترادفات کی زد میں نہیں آسکتے، اس لیے معنیاتی فضا بدل جاتی ہے۔ اس فہرست میں مترادفات درج کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا گیا کہ لفظی طور پر جو مترادف دیا گیا ہے، کیا وہ فعلی اور ترکیبی شکلوں میں استعمال ہوسکتا ہے۔ مثلاً "ہوا" کے آگے "وایو" رکھ دیا گیا ہے لیکن یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ کیا ہوادار، ہوا باز یا ہوائی چھوڑنا کا مسئلہ "وایو" سے حل ہوسکتا ہے؟

فرض کیجیے عام لفظوں کو تو مترادفات کے ذریعے بدل بھی لیا جائے، لیکن ناموں کا کیا کیجیے گا۔ بعض ناموں میں تو زبانوں کا سنجوگ عجیب وغریب شکلیں اختیار کرتا ہے۔ مثلاً بدھ یعنی گوتم بدھ کے مجسموں کے نام سے فارسی نے "بت" بنا لیا۔ گورو تیغ بہادر کا نام کس نے نہیں سنا۔ نیپال کبھی مسلمانوں کے زیرِ نگیں نہیں رہا، لیکن شمشیر جنگ رانا اور بیر جنگ رانا زبانوں کی آمیزش کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ اسی طرح چودھری، کنور اور راجا کے القاب مسلمانوں کے نام کے ساتھ عام استعمال ہوتے ہیں۔ صاحب اور سردار ہندوؤں اور سکھوں کے ناموں کے جزو ہیں۔ اور تو اور صاحب رام، مالک رام، حاکم رائے، نوبت رائے، خوشی چند، شادی لال،

چمن لال، حضور سنگھ، گورنجش سنگھ، ذیل سنگھ، ہوشیار سنگھ، اقبال سنگھ، بختاور سنگھ جیسے نام ہندوؤں سکھوں میں عام طور پر سنائی دیتے ہیں۔ اشتراک کے ذیل میں افعال، امدادی افعال اور مرکب افعال کی تفصیل پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ اسی طرح جسم کے حصّوں کے نام یا رشتے داریاں (ماں باپ، بھائی بہن، بیٹا بیٹی، دادا دادی، نانا نانی، چچا، ماما وغیرہ) یا گنتیاں یا موسموں کے نام یا ضمیریں یا الفاظِ تمیز یا حروفِ جار سب ایک ہیں۔ نیز دو عنصری الفاظ (راج دربار، عجائب گھر، ڈاک گھر، چٹھی رساں) دونوں زبانوں کی گنگا جمنی خصوصیت پر دال ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ لسانی بوجھ ان سابقوں اور لاحقوں پر پڑتا ہے جو سیکڑوں ترکیبوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً بے (بے کل، بے گھر)۔ دان (پان دان، پھول دان) بان (گاڑی بان، رتھ بان)۔ دار (تھانیدار، سمجھ دار)۔ باز (دھوکے باز، بٹیر باز) یا ہندی لاحقے جو عربی فارسی لفظوں کے ساتھ لگتے ہیں مثلاً لا (جوشیلا، نشیلا) پن (دیوانہ پن)، اسی طرح اشتراک کی یہ فضا کھانے، مٹھائیوں اور پھلوں پھولوں کے ناموں میں بھی ملتی ہے۔ (حلوہ، گلاب جامن، برفی، فالودہ، قلاقند یا سیب، شریفہ، اخروٹ، پستہ، بادام، انار، انگور یا روغنی روٹی، رومالی روٹی، حبشی حلوہ، موتی پلاؤ، نرگسی پلاؤ، نرگسی کوفتہ) دونوں زبانوں کا باہمی اشتراک و ارتباط ناقابلِ شکست حد تک ضرب الامثال اور کہاوتوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً "چولی دامن کا ساتھ"۔ "گوشت کا ناخن سے جدا ہونا"۔ "چہرہ فق ہونا"۔ "پانْو تلے سے زمین نکلنا"۔ "باغ باغ ہونا"۔ "کشتی کنارے آ لگنا"۔ "گھی کے چراغ جلانا"۔ "خون سفید ہونا" وغیرہ سے ظاہر ہے کہ ایسے محاوروں یا کہاوتوں میں عربی فارسی کے لفظ شامل نہ ہوں تو محاورہ یا کہاوت بن ہی نہیں سکتی۔ یہ وہ سرمایہ ہے جسے ہندی والے بھی اپنا سمجھ کر برتتے ہیں۔ ہندی اُردو کی کچھ کہاوتیں ایسی بھی ہیں جو واضح طور پر مذہبی اثرات لیے ہوئے ہیں یعنی "مفت کی مرغی قاضی کو بھی حلال"۔ "میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی"۔ "دو ملّاؤں میں مرغی حرام"۔ "نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے"۔ "نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی"۔ یہ کہاوتیں جیسی اُردو میں استعمال ہوتی ہیں ویسی ہندی

میں بھی استعمال ہوتی ہیں ۔ ان عناصر کے پیشِ نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُردو رسم الخط اور اس کی لفظیات بدیسی ہے تو یہ تمام اثرات بھی بدیسی ہیں۔ انھیں کیسے قبول کرلیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ایسے تمام اثرات کو رد کردیا جائے تو ہندستان گیر حیثیت سے ہندی کا تصور کرنا بھی مشکل ہوگا۔

اس بحث سے چند نتیجے آسانی سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اُردو اور ہندی اپنی بنیاد اور جڑ سے ایک ہیں۔ ان کی نشو و نما اس طور پر ہوئی کہ اب یہ دو آزاد مستقل بالذات اور الگ الگ زبانیں ہیں۔ البتہ کئی سطحوں پر یہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتیں۔ اس باہمی اشتراک کی وجہ سے موجودہ لسانی صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر ہندی اور اردو کو دو دائروں کی شکل میں ظاہر کیا جائے تو دونوں دائرے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آئیں گے اور دونوں دائروں کا نصف سے زیادہ حصّہ منطبق ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اردو میں تقریباً تین چوتھائی الفاظ دیسی ہیں یعنی وہی ہیں جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی فارسی سے مستعار سرمایہ صرف دس پندرہ ہزار لفظوں کا ہے اور یہ بھی سب کا سب استعمال نہیں ہوتا۔ گمان ہے کہ اردو شاعروں اور ادیبوں کے یہاں اس سرمایے کا بھی زیادہ سے زیادہ نصف حصّہ یعنی چھ سات ہزار لفظ استعمال ہوتے ہیں اور یہ سرمایہ بھی اردوانے یا ہندیانے کے نامیاتی عمل سے گزرا ہے اور اس میں صوتی، صرفی، نحوی اور معنوی تبدیلیاں ہوئی ہیں، تب کہیں جاکر یہ اردو کا جزوِ بدن ہوسکا ہے۔ دوسری طرف ہندی میں عربی فارسی سے مستعار اردو کے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں اور یہ وہ لفظ ہیں جو کثیر الاستعمال ہیں اور جن کے بغیر ہندی میں طرح طرح کی دقتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ہندی کے ساتھ اردو کے بقائے باہم کے لیے اس بات کے عرفان کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ بنیادی طور پر تو اردو ہند آریائی زبان ہے ہی، نیز اپنے ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط کے معاملے میں بھی وہ اتنی غیر ملکی نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے۔ جب اردو اتنی روادار ہوسکتی ہے کہ اپنی کل

لفظیات میں تین چوتھائی کی حد تک یعنی چالیس پینتالیس ہزار الفاظ ہندی کے برت سکتی ہے اور پراکرتوں کے تدبھو کی بہترین امین بھی ہے تو کیوں نہ ہندی بھی اُردو کے دو ہزار لفظوں کے بارے میں فیاضی کا ثبوت دے اور انھیں اپنی بنیادی لفظیات کے طور پر تسلیم کرے اور ان کے استعمال کو ذہنی تحفظات اور تعصبات کا شکار نہ ہونے دے۔ اس سے دونوں زبانوں میں باہمی اشتراک اور لسانی بھائی چارے کی فضا مضبوط ہوگی اور سیاست دانوں کی خودغرضانہ اور تنگ نظرانہ تاویلیں اور غلط بیانیاں اس رشتے کو نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اُردو لغت اور لغت نگاری

عسکری صاحب مرحوم نے ایک بار مجھ کو لکھا تھا کہ بعض اوقات انھیں ڈرامے سے لے کر آڈن تک دس کے دس پرچے ایم اے کے درجوں کو پڑھانے پڑتے ہیں۔ یہ پڑھ کر مجھے ان کے اور اپنے مرحوم استاد، پروفیسر ایس۔ سی۔ دیب (S.C. DEB) یاد آئے جو ہر وہ مضمون پڑھادیا کرتے تھے جن کا استاد کسی وجہ سے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضر ہو چنانچہ مجھے اُن سے تاریخ ادب، علم اللسان، تنقید، شکسپیئر، ہر موضوع پر ایک دو لکچر سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ علمیت کے اعتبار سے پروفیسر دیب صاحب (جو عسکری صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور جس کے نام عسکری صاحب نے اپنی کتاب "جزیرے" معنون کی ہے) عسکری صاحب سے کچھ زیادہ ہی تھے، اور میں ان دونوں حضرات کا پاسنگ بھی نہیں ہوں، لیکن بعض اوقات مجھ پر بھی وہی آزمائشی وقت آپڑتا ہے، جو ان مرحومین کا مقدر تھا، یعنی مجھے ایسے موضوعات پر لکھنے کی سوجھتی ہے یا لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، جو میرا میدان نہیں ہے۔ لغت نگاری ایسا ہی ایک موضوع ہے۔ لیکن ان دنوں ہمارے یہاں لغت نگاری میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یہ انتہائی خوش آیند اور مبارک فال ہے، کیوں کہ اعلیٰ درجے کے لغات کے بغیر زبان کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ ہمارے یہاں اچھے لغات کی سخت کمی ہے اور جو لغات ہیں بھی، وہ یا تو ناقص ہیں، یا کمیاب، بلکہ نایاب ہیں۔ "فرہنگ آصفیہ" کچھ عرصہ ہوا ترقی اردو بیورو حکومت ہند نے دوبارہ شائع کی، ورنہ پہلے یہ بالکل ناپید تھی۔ "نور اللغات" آنکھوں سے لگانے کے لیے بھی نہیں ملتی۔ پاکستان میں کچھ دن ہوئے چھپی تھی، لیکن

اب وہاں بھی بازار میں نہیں ملتی۔ "امیر اللغات" نامکمل رہ گئی لیکن جیسی بھی ہے کہیں نہیں ملتی۔ پلیٹس (PLATTS) اور ڈنکن فوربس (DUNCAN-FORBES) کے اردو۔ انگریزی لغات دوبارہ بازار میں آگئے ہیں، لیکن یہ بے حد مہنگے ہیں، پرانے بھی ہیں۔ اور اردو سے انگریزی میں ہونے کی بنا پر اُردو کے عام طالب علم کے لیے پوری طرح کارآمد بھی نہیں۔ اب ترقی اُردو بیورو حکومت ہند "نور اللغات" کو دوبارہ شائع کرنے کا انتظام کر رہا ہے۔ پلیٹس کے لغت پر خورشید الاسلام اور رالف رسل صاحبان کی نگرانی میں نظر ثانی ہو رہی ہے، لیکن سنا ہے اس نظر ثانی میں اس کے بعض اہم عناصر (مثلاً الفاظ کی اصل) خارج کر دیے جائیں گے۔ غرض کہ زبان کا مکمل احاطہ کرنے والا اس وقت کوئی مکمل لغت بازار میں نہیں ہے۔ "مہذب اللغات" ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ ترقی اردو بیورو، حکومت ہند کا پنج جلدی لغت بھی ابھی تکمیل کی منزل سے بہت دُور ہے، اور پاکستان کے ترقی اردو بورڈ کا عظیم الشان لغت، جو تاریخی اصول پر ہے، ابھی پورا چھپ نہیں سکا ہے۔ اس کی صرف دو جلدیں سامنے آئی ہیں۔ اردو انگریزی کا ایک نیا لغت بھی ترقی اُردو بیورو، حکومت ہند کے زیر اہتمام تیار ہو رہا ہے۔ لغت نگاری کے میدان میں اس غیر معمولی سرگرمی، لیکن مناسب لغات کی کمی کی وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے اصولوں سے متعلق بعض بنیادی سوالات اٹھائے جائیں، اور بعض اہم لغات کا مختصر جائزہ بھی لیا جائے۔

بنیادی سوالات اٹھانے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ کوئی بھی علمی کارروائی کسی فلسفیانہ یا نظریاتی اساس (یا اگر واضح اساس نہیں تو مضمر تصورات) کے بغیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ہر نظریہ یا فلسفہ اصلاً اور اصولاً "کیوں" اور "کس لیے" سے بحث کرتا ہے، اس لیے لغت نگار کے سامنے بھی سب سے پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ وہ لغت کیوں اور کس لیے لکھ رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا آسان جواب تو یہ ہے کہ میں لغت اس لیے لکھ رہا ہوں کہ خود کو اس کام کا اہل سمجھتا ہوں، اور میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت بازار میں جتنے لغات ہیں، وہ لغت نگاری کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ لیکن اس جواب پر دوسرا سوال فوراً اٹھیگا کہ لغت نگاری کے تقاضے

ہیں کیا؟ کیا قدیم لغت نگاروں نے ان تقاضوں کی چھان بین نہیں کی، اور کیا انھوں نے ترجیحات مقرر نہیں کر دی ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو کیا ان کی وہ چھان بین کافی وشافی ہے اور کیا وہ ترجیحات درست ہیں؟ اگر نہیں، تو آپ کے سامنے کیا تقاضے ہیں؟ اور اگر ان تقاضوں کا واضح تصور آپ کے ذہن میں نہ ہو، تو کم از کم تصور تو ضرور ہوگا کہ لغت نگار میں کیسی لیاقت و قابلیت کا ہونا ضروری ہے؟

جہاں تک قدیم لغت نگاروں کا سوال ہے، انھوں نے لغت نگاری کے تقاضوں سے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ میر علی اوسط رشک کی "نفس اللغۃ" اور رضا من علی جلال کی "گنجینۂ زبان اردو" میں اردو الفاظ کے معنی فارسی میں بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر کوئی اردو داں شخص ان سے استفادہ کرنا چاہے، تو پہلے وہ فارسی پڑھے۔ ہاں کوئی فارسی داں شخص ان سے استفادہ کرنا چاہے، تو بہت خوب، لیکن ہمارے ملک میں پہلے بھی اکثر، اور آج کل تو بالکل، یہی ہوا ہے کہ کچھ اردو دانوں نے تو فارسی سیکھی ہے لیکن فارسی دانوں نے اردو نہیں سیکھی۔ جو فارسی بولنے والے یہاں آ کر رہ بس گئے، انھوں نے آہستہ آہستہ فارسی ترک کر کے اردو کو مادری زبان کے طور پر اختیار کر لیا اور اردو کے فارسی لغت سے بے نیاز ہو گئے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو ایرانی یہاں رہ بس بیٹھے، وہ زیادہ تر ایسے زمانے میں آئے تھے، جب اردو کا وجود مشتبہ اور چلن معدوم تھا۔ اور یہ لغات لکھے گئے ہیں انیسویں صدی میں، لہٰذا ان کی افادیت معلوم۔

امیر مینائی نے "امیر اللغات" (۱۸۹۱) میں کوشش کی کہ اصطلاحات، مشہور شعرا کے مختصر حالات، مشہور چیزوں اور اشخاص کے مختصر تذکرے، فقیروں کی صدائیں، بولیاں ٹھولیاں، سب شامل کر لی جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر مینائی کے نزدیک لغت اگر بالکل قاموس نہیں، تو قاموس نما ضرور ہونا چاہیے، یعنی ایسی کتاب جس میں الفاظ کے علاوہ کئی اور چیزوں کے بارے میں بھی معلومات یکجا ہوں۔ "فرہنگ آصفیہ" میں بھی مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کی فرہنگ دراصل "انسائیکلوپیڈیا ان اردو" کا حکم رکھتی ہے۔ "امیر اللغات" کا تو حال معلوم نہیں، لیکن "آصفیہ" میں دعویٰ ہے کہ اگر کچھ چھوڑا ہے، تو محض "مغلظات اور فحش" چھوڑا ہے۔ یعنی دونوں صاحبان کے نزدیک لغت دراصل تمام معلومات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ صاحب "آصفیہ" نے اپنی

کتاب کو "فرہنگ" سے تعبیر کیا ہے، حال آں کہ رجیسا کہ قاضی عبدالودود نے بھی لکھا ہے) خود انھوں نے دوسروں کے اردو لغات کو "فرہنگ" کہنے پر اعتراض کیا ہے اور اپنی کتاب میں "فرہنگ" کے معنی دیے ہیں: "کتابِ لغاتِ فارسی"، لہٰذا ان کے قول اور فعل میں اور بھی تضاد نظر آتا ہے۔ جب مصنف کو اپنی کتاب کی اصل صنف ہی نہیں معلوم، تو اس کتاب کی تصنیف کے لیے انھوں نے کوئی نظریاتی اساس کیا مرتب کی ہوگی۔

صاحبِ "امیراللغات" اور صاحبِ "آصفیہ" دونوں ان سوالات سے بے نیاز ہیں کہ الفاظ کے معنی، مرادف، تعریف —— ان چیزوں میں کوئی فرق ہے کہ نہیں۔ صاحبِ "امیراللغات" لغات کے حقیقی اور مجازی معنوی کی تعبیریں اور ان کا محلِ استعمال، زبان اردو یا کسی مانوس زبان میں اس کے مستعملہ مروجہ مترادفات اور متضاد لفظ جمع کر دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک لغت کا کام یہ بھی ہے کہ الفاظ کے متضادات اور محلِ استعمال بھی بیان کرے۔ صاحبِ آصفیہ" مترادف ہم معنی، ہم پہلو الفاظ یک جا کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں، "متروک اور غیر متروک الفاظ کی تمیز اور فصیح غیر فصیح محاورات کا تصفیہ بھی کرنے کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں۔ "لفظ" سے ان کی مراد ہے، یعنی حروف کے وہ کون سے مجموعے ہیں، جن پر اصطلاح "لفظ" کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس بات میں صاحبِ "امیراللغات" اور صاحبِ "آصفیہ" دونوں کا ذہن صاف نہیں ہے۔

صاحبِ نوراللغات نے اپنی بنیادوں میں کچھ منطق، یا کچھ فکر، رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لغت وہ کتاب ہے جس کے ذریعہ ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ "زبانِ اُردو کے وسیع باغ میں جو پھولوں سے بھرا ہرا کیسا مہک رہا ہے کہ شاید ہندستان کا کوئی دماغ ایسا نہ ہو، جس میں اس کی خوشبو کی لپٹ نہ پہنچی ہوں؛ یہ مختلف پھول کہاں سے آئے ہیں؟ جڑ کہاں سے پھوٹی، اور اختلافِ آب و ہوا سے رنگت پر کیا اثر کیا۔ ہر ایک

۱. صاحبِ "آصفیہ" کے قول و فعل میں جگہ جگہ تضاد بھی ہے۔ انھوں نے بہت کم الفاظ ایسے چھوڑے ہیں، جنھیں فحش یا مغلظات کہا جا سکے۔ اسی طرح قاموسیت کا دعویٰ کرنے کے باوجود انھوں نے "ہیثم طار" جیسے مشہور ناموں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے "اسکالرشپ" جیسا غریب اور غیر اردو لفظ تو لیا ہے، لیکن شہر "اسکندریہ" کو بھول گئے ہیں۔

پھول میں کسی طرح کی خوشبو موجود ہے جس کا امتیاز آسان نہیں ۔" گویا ان کے نزدیک "لغت کا اصل کام یہ ہے کہ الفاظ کی اصل معلوم کرے اور ان کے معانی کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کرے ۔" لیکن الفاظ کی اصل بیان کرتے میں کس حد تک تفصیل سے کام لیا جائے ، اور معانی بیان کرنے سے کیا مراد ہے ، اس باب میں وہ خاموش ہیں ۔ نہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جن الفاظ کے معانی مختلف پہلو نہیں رکھتے ، ان کے معانی مرادف کے ذریعہ بیان کیے جائیں یا تعریف کے ذریعہ یا دونوں طرح ۔

یہ تو رہا قدما کا حال ۔ اب معاصرین کو دیکھیے ؛ مولوی عبدالحق کو لغت نگاری سے خاص دلچسپی تھی ، انھوں نے اس سلسلے میں کئی مفید کام کیے اور بعض نظریاتی مباحث بھی اٹھائے ۔ مثلاً انھوں نے لکھا :

> ایک کامل لغت میں ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہوگا کہ وہ کب ، کس طرح کس شکل میں اردو زبان میں آیا ، اور اس کے بعد سے اور اس وقت سے تاحال اس کی شکل وصورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے ۔ ... ہماری لغات میں عموماً لفظ کی تعریف نہیں دی جاتی ، بلکہ اکثر ہر لفظ کے سامنے اس کے کئی کئی مترادفات لکھ دیے جاتے ہیں ۔ ... ایک ناواقف شخص کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر مترادف کہاں تک اس لفظ کا ہم معنی ہے ، یا سیاق وسباق کی رُو سے ان معانی میں کون سا ٹھیک بیٹھتا ہے ، اور جو شخص مترادف کے معنی نہیں سمجھتا وہ اس لفظ کے مفہوم کو بھی نہ سمجھےگا ۔ ... لغت میں سب لفظ ہونے چاہییں ، خواہ وہ رائج ہوں یا متروک اور ان کے تمام معانی اور استعمال درج کرنے لازم ہیں ۔ ... عامیانہ اور سوقیانہ میں بھی فرق کرنا ضروری ہے ۔ ... اجنبی زبانوں کے الفاظ ہیں ، جو اردو زبان میں داخل ہو چکے ہیں یا داخل ہو رہے ہیں ، ان کا شمار بھی الفاظ بھی ہونا چاہیے ۔ پھر اعلام ہیں ، جن کا اگرچہ ایک عام لغت سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن کچھ ان میں ایسے ہیں کہ جن سے ادب میں جگہ جگہ مڈ بھیڑ ہوتی ہے ۔ لہٰذا لغت نویس کو ان کا خیال

رکھنا پڑیگا ۔۔۔۔ انسائیکلوپیڈیا اور لغات میں حدود قائم کرنا بہت دشوار ہے ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ ان کی تشریح کامل طور پر اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ان اشیا ، کا جن کا مفہوم وہ ادا کرتے ہیں کچھ نہ کچھ ذکر نہ کیا جائے ۔ علاوہ اس کے اشیاء کا بیان ، اسماکی تعریف میں مضر ہوتا ہے ۔ اس لیے ڈکشنری کے صحیح طور پر مرتب کرنے کے لیے ان دونوں طریقوں کا امتزاج خاص کر اردو لغت میں ، ضروری ہے ۔۔۔ حال کے زمانے میں بہت سے الفاظ بنے اور بنتے جاتے ہیں اور آیندہ بنینگے ۔۔۔ ان میں سے بعض دیر سویر عام گفتگو میں اور گفتگو سے اخبارات تک آ پہنچتے ہیں اور اخبارات سے انشا اور ادب میں داخل ہو جاتے ہیں ۔ اردو کا لغت نویس ان الفاظ کو نظر انداز نہیں کرسکتا ۔

مولوی عبدالحق کا یہ دیباچہ (جس کے اقتباسات اوپر نقل ہوئے) بخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ فلسفۂ لغت نگاری پر اردو میں پہلا اور آخری بیان ہے ۔ مولوی صاحب نے تقریباً تمام ضروری باتوں کا ذکر اشارتاً یا صراحتاً کر دیا ہے لیکن لغت نگاری سے غیر معمولی دلچسپی کے باوجود مولوی صاحب باقاعدہ لغت نگار نہیں تھے ۔ ان کا ذہن بھی منطقی نہ تھا ۔ اس لیے مندرجۂ بالا اقتباسات میں بعض ناقابلِ قبول تصورات کے علاوہ بہت سے منطقی مسامحے اور فروگزاشتیں بھی ہیں ۔ ان کا تفصیلی تجزیہ ضروری ہے ، اس لیے بھی کہ اس تجزیے کی روشنی میں لغت نگاری کے فلسفے اور منطق کے بارے میں بعض بنیادی مباحث بھی سامنے آجائینگے ۔

مولوی صاحب نے اس بات کا تصفیہ کہیں نہیں کیا کہ لفظ ہوتا کیا ہے ؟ لفظ بطور لفظ اور لفظ بطور اصطلاح کے فرق کا وہ احساس کرتے ہیں ، لیکن حروف کے کن مجموعوں یا تراکیب کو ہم لفظ کہینگے اور رکن کو نہیں ، اس بارے میں وہ خاموش ہیں ۔ تابع مہمل الفاظ ، لفظ ہیں کہ نہیں ، اس کے بارے میں بھی انھوں نے کچھ نہیں کہا ۔ حیرت یا استعجاب یا تکلیف یا خوشی یا نفرت کے عالم میں ، یا ان جذبات کا اظہار کرنے کے لیے ، جو آوازیں کسی زبان کے بولنے والے انسان کے منھ سے نکل جاتی ہیں ۔ وہ لفظ ہیں یا نہیں ؟ لفظ بامعنی ہی ہوتے ہیں ، یا بےمعنی بھی ۔ اس بات میں بھی وہ خاموش ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ماہرین لسانیات اب تک یہ فیصلہ نہیں کرسکے کہ "لفظ" کسے کہتے ہیں ؟

لیکن اگر اس فیصلے کا انتظار کرنا ہے تو لغت لکھنے کی کھکھیڑ کیوں اٹھائی جائے؟ ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی تعریف تو متعین کرنا ہی ہوگی۔

۲۔ لفظ کی تعریف متعین کرنے سے پہلوتہی کرنے کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے لفظ کے املا کے بارے میں بھی کچھ کہنے سے گریز کیا ہے۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ لغت نگار کو ضروری ہے کہ اس بات کی وضاحت کرے کہ کوئی لفظ کس شکل میں زبان میں داخل ہوا اور تا حال اس کی شکل وصورت میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ لیکن لفظ کی "شکل وصورت" کی اصطلاح گمراہ کن ہے۔ اس لیے کہ بہت سے الفاظ پہلے زبانوں پر رواں ہوتے ہیں، پھر تحریر میں آتے ہیں۔ بہت سے الفاظ تحریر میں پہلے آتے ہیں، اور زبانوں پر بعد میں رواں ہوتے ہیں (اگر ہوتے ہیں) بہت سے الفاظ تحریر میں کسی طرح رائج ہیں، اور زبانوں پر کسی اور طرح۔ بہت سے الفاظ کے بارے میں یہ فیصلہ ہی ناممکن ہے کہ وہ کس طرح رائج ہوئے۔ (مثلاً یہی دیکھیے کہ ہزاروں دیسی الفاظ میں ہمزہ کہاں سے آیا؛ اور ہزاروں الفاظ میں عربی فارسی آوازوں کے ساتھ وہ آوازیں کہاں سے داخل ہوئیں جو ان زبانوں میں ہیں ہی نہیں؟) لہٰذا "شکل وصورت" کا چکر چلانا بے معنی ہے۔ ہر لفظ کا صحیح املا درج کرنا ضروری ہے۔

۳۔ اور جب صحیح املا کا جھگڑا اٹھیگا تو پھر درجنوں طرح کی ترجیحات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ کیا املا مروج تلفظ کے مطابق ہو، یا اصل تلفظ کے مطابق ہو؟ کیا املا مروج املا کے موافق ہو، یا اصل املا کے موافق ہو؟ "جمع" کو "جما" یا "جمہ" لکھیں کہ نہیں؟ یا نہ بھی لکھیں تو کیا اس بات کا اظہار کر دیں کہ اصل املا اور تلفظ میں "جما" یا "جمہ" ہے، لیکن تحریر اور شاعری میں اصل املا اور اصل تلفظ کا خیال رکھتے ہیں؟ "شکوہ" کو "شکوی" ہی لکھیں یا "شکوہ" اور "شکویٰ" دونوں ہی درج کریں؟ "یورش" کو درج کریں یا محض "یُرش" لکھ کر چھوڑ دیں؟ اور ہمزہ والے دیسی الفاظ میں کیا کریں؟ "کریے" میں ہمزہ اور "یے" کے دو نقطے ہوں یا نہیں؟ اور اگر ہوں، تو "کیجیے" میں کیوں نہ ہوں؟ مرکب الفاظ، مثلاً "خوب صورت"، "گلرو" کو توڑ کر لکھا جائے یا ملا کر؟ الف مقصورہ والے الفاظ ("متوفی" وغیرہ) کو پورے الف سے لکھا جائے کہ نہیں؟ دیسی الفاظ جو ہائے ہوز پر ختم ہوتے ہیں۔ (جیسے "پیسہ") ان کو الف سے لکھا جائے یا نہیں؟ مولوی عبدالحق کو ان تمام

معاملات سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی۔

۴۔ مولوی صاحب نے تلفظ کی صحت پر اصرار کیا ہے، لیکن صحیح تلفظ کی تعریف متعین نہیں کی ہے۔ ایسے انوکھے یا غریب الفاظ مثلاً "مورد" ("میم" پر زبر، "رے" کے نیچے زیر) ہو" "ملو" (لام پر زبر) یا "خودرو" (رے پر پیش) کو تو چھوڑ دیجیے، عام الفاظ کا صحیح تلفظ کیوں کر متعین ہو؟ "حماقت" اکثر لکھنؤ والے "ح" پر زبر سے بولتے ہیں۔ دلی والے ۹۹ کا تلفظ نون ثانی کی تشدید اور اس کے بعد یائے مجہول لگا کر ادا کرتے ہیں۔ اچھا، ان کو بھی چھوڑیے؛ وہ الفاظ جو عام پڑھے لکھے لوگ بولتے کسی طرح ہیں، لیکن لکھتے کسی اور طرح ہیں (مثلاً "شہر"، "شرح" وغیرہ) ان کا تلفظ کس طرح بیان کیا جائے؟ مولوی صاحب اس بحث میں اترتے ہی نہیں۔

۵۔ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ ہر لفظ کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ کب اور کس طرح اور کس شکل میں اُردو زبان پر آیا۔ یہ تینوں باتیں بے اصول ہیں "کب" کا تو معاملہ یہ ہے کہ اردو کے ہزارہا الفاظ اور سابقے لاحقے ہیں، جن کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آئے، کس طرح آئے؟ یہ تو کسی لفظ کے بارے میں بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ لفظ کوئی چیز نہیں ہوتا، جسے اٹھا کر لے جایا جا سکے اور جس کا اندراج کسی امپورٹ فہرست میں ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں لفظ شاید فلاں لفظ سے یا اُس کے تشابہ سے بنا ہو۔ اور یہ بھی سب لفظوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ "کس شکل" کا جھگڑا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ جو لفظ زبان پر پہلے رواں ہوا، اس کی شکل کوئی کیا بتائے اور جو لفظ پہلے تحریر میں آیا اس کے بارے میں کون طے کرے کہ یہ لفظ سب سے پہلے تحریر میں کب آیا؟ اور یہی معاملہ کون سا طے ہو گیا ہے کہ کون سا لفظ زبان پر پہلے رواں ہوا اور کون سا لفظ تحریر میں پہلے مروج ہوا۔ اصل میں یہ معاملات علم اللسان (PHILOLOGY) سے تعلق رکھتے ہیں۔ لغت نگاری سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں۔ لغت نگار کا کام صرف یہ ہے کہ ہر ممکن حد تک ہر لفظ کی اصل، یعنی وہ جس زبان سے آیا ہے (یا شاید آیا ہے) اس کی نشاندہی کر دے، اور اگر اس کی جڑ با سلسلہ بہ سلسلہ

کئی زبانوں سے ہوتی آئی ہے، تو اس کی بھی نشاندہی کردے۔ ممکن ہو تو یہ بھی بتا دے کہ اس کی قدیم ترین اور جدید ترین مثالیں اور کہاں ہیں۔ باقی سب ڈھکوسلا ہے۔

۶۔ لفظ کی شکل و صورت میں (یعنی غالباً املا میں) کیا کیا تغیر ہوئے، اس کا تصفیہ صرف اس تاریخ کی حد تک ہو سکتا ہے، جس تاریخ سے اس کی تحریری شکل ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن یہاں مولوی عبدالحق صاحب نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ تغیری شکلوں کا الگ اندراج کیا جائے، یا ان سب کو ایک ہی جگہ لکھ دیا جائے۔ آکسفرڈ ڈکشنری (O.E.D.) نے تو سب کچھ ایک ہی جگہ لکھ دیا ہے۔ کیوں کہ قدیم زبان کے لغات الگ سے موجود ہیں اور تمام قدیم ادیبوں کی نگارشات جدید املا میں بھی چھاپ دی گئی ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں ہوا۔ لہٰذا مشکل یہ ہے کہ اگر ان سب کو ایک ہی جگہ لکھ دیا جائے، تو بعض الفاظ ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ مثلاً دو لفظ بالکل سامنے کے سمجھ لیجیے۔ "سے" کی شکلیں "سوں" "سیں" اور "ستی" بھی ہیں۔ اگر ان سب کو "سے" کے تحت درج کر دیا جائے، تو دکنی یا اوائل اٹھارویں صدی کی دہلوی تحریریں پڑھنے والا مر تا مر جائے، وہ "ستی" کے معنی نہیں معلوم کر سکیگا۔ ایک اور لفظ لیجیے: "اور"۔ اس کی ایک شکل "ہور" ہے، اور ایک "ملفظ" "ار" (سبب خفیف) ہے، ان دونوں کا اندراج ضروری ہے۔ (آصفیہ، نور اللغات اور کراچی کے "اردو لغت" کسی میں بھی "ار" درج نہیں ہے، حال آں کہ شاعری میں ہزاروں جگہ "اور" لکھ کر "ار" پڑھا جاتا ہے۔ "نور اللغات" میں اتنا تو لکھا ہے کہ بعض جگہ "اور" بروزن "فع" بھی آتا ہے، "آصفیہ" اور "اردو لغت" (کراچی) نے اتنا بھی نہیں کیا۔)

۷۔ مولوی صاحب معانی کے تغیرات کی صراحت بھی ضروری سمجھتے ہیں، (اور یہ ہے بھی بہت ضروری) لیکن اگلے سانس میں وہ مرادف اور تعریف میں فرق کا ذکر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر لفظ کی تعریف دی جائے؛ مرادف سے کام نہیں چلیگا۔ اس میں گھپلا یہ ہے کہ وہ معنی، مرادف اور تعریف کے الگ الگ تفاعل کو نہیں سمجھتے۔

۸۔ "لفظ" کی تعریف متعین کیے بغیر وہ چاہتے ہیں کہ لغت میں سب لفظ درج کیے جائیں، لیکن پھر گھبرا کر یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ عامیانہ اور سوقیانہ میں فرق ضروری ہے (یعنی ان کے نزدیک عامیانہ لفظ تو شامل ہونا چاہیے، لیکن سوقیانہ لفظ شامل

نہ ہونا چاہیے۔ پھر وہ دعویٰ کہاں رہا کہ لغت میں سب لفظ درج ہوں؟ اصل میں یہ مشکل اس وجہ سے آپڑی ہے کہ مولوی صاحب (بلکہ ہمارے تمام لغت نگاروں) کے ذہن میں یہ بات صاف نہیں ہے کہ ان کا لغت کسی پڑھنے والے کے لیے ہے؟ بچوں کے لیئے نو تعلیم بالغوں کے لیے، غیر ملکیوں کے لیے، ادب کا تاریخی مطالعہ کرنے والوں کے لیئے اخبار پڑھنے والوں کے لیے، آخر کس کے لیے؟ اور لغت مرتب کرنے کا مقصد کیا ہے؟ الفاظ کو محفوظ کر دینا، مروّج الفاظ کو جمع کر دینا، ان الفاظ کو چھوڑ دینا جن کے معنی شاید ہی کبھی کسی کو درکار ہوں (مثلاً "میم" یائے معروف، سین مکسور بمعنی خوب صورت)، ان الفاظ کو ترک کر دینا جن کے معنی سب کو معلوم ہیں (مثلاً "گھر")؛ ان الفاظ کو داخل کرنا جو کسی مصنّف نے کہیں بھی استعمال کیے ہوں؟ آخر آپ کے لغت کا مفروضہ قاری کون ہے، اور آپ کے لغت کا مقصد کیا ہے؟ مولوی صاحب کہہ چکے ہیں کہ وہ "کامل لغت" کے تقاضے بیان کر رہے ہیں۔ لہٰذا ایسا لغت سب لوگوں کے لیے ان کے حسب توفیق کارآمد ہو گا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسے لغت میں تمام الفاظ لیے جائیںگے، وہ سوقیانہ ہوں یا عامیانہ، عالمانہ یا صحافیانہ، (ہاں "لفظ" کی تعریف ضرور متعین کرنا ہوگی)۔

۹۔ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ اجنبی زبانوں کے جو لفظ اردو میں داخل ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں، ان کو بھی درج کیا جائے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو لفظ اردو میں داخل ہو چکے وہ اجنبی زبان کے نہیں، اردو کے لفظ ہو گئے، اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ان لفظوں کی تعریف یا تعیّن ناممکن ہے، جو زبان میں "داخل ہو رہے ہیں"۔

۱۰۔ اعلام کے بارے میں ان کا نظریہ کم و بیش درست ہے، لیکن وہ یہ بات خواہ مخواہ کہتے ہیں کہ وہی اعلام شامل کیے جائیں، جن سے ہماری "مڈ بھیڑ" ادب میں جگہ جگہ ہوتی ہے۔ معلوم نہیں "ادب" سے ان کی کیا مراد ہے؟ وہ زبان کا لغت مرتب کرنا چاہتے ہیں یا "ادب" میں استعمال ہونے والے الفاظ و اعلام کی فرہنگ؟ جو اعلام اپنے اصل معنی (یعنی بطور عَلَم) کے علاوہ کسی بھی مجازی معنی میں مستعمل ہیں، ان سب کو لغت میں آنا چاہیے، اس میں ادب اور غیر ادب کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟

۱۱۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت سے الفاظ بنتے جاتے ہیں اور گفتگو سے اخبارات، اخبارات

سے ادب وانشا میں داخل ہوتے جاتے ہیں؛ اور ایسے تمام الفاظ کو لغت میں آنا چاہیے۔ بالکل درست۔ لیکن کس وقت؟ کیا جب وہ انشا و ادب کا حصّہ بن جائیں؟ اگر ہاں، تو پھر وہی مشکل آپڑتی ہے کہ آپ ادب میں استعمال ہونے والے الفاظ کی فرہنگ لکھ رہے ہیں، یا زبان کا لغت مرتب کر رہے ہیں؟

۱۲۔ اپنی تمام تفصیلات کے باوجود مولوی صاحب اس بنیادی بات کو بھی نظر انداز کر گئے ہیں کہ لغت نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ زبان کے حروفِ تہجّی اور ان کی ترتیب کو واضح کرے اور الفاظ کو اس ترتیب سے درج کرے جو اس کے خیال میں صحیح ترین اور زبان میں مروّج ہے۔

۱۳۔ مولوی صاحب اردو کا لغت مرتّب کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو میں افعال کی تصریفی شکلوں میں بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ اہلِ زبان ہو یا غیر اہلِ زبان، اس کو یہ مشکل پیش آسکتی ہے کہ کسی فعل کا ماضی مطلق کیا ہے اور وہ کس طرح لکھا جائیگا۔ انگریزی میں ایسے افعال بہت نہیں ہیں، لیکن جتنے بھی ہیں، ان کا ماضیِ مطلق اور ماضی بعید مع تلفظ کے بیان کرنا ہر انگریزی لغت نگار اپنا فرض جانتا ہے۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ نہ "آصفیہ" نہ "نور اللغات" نہ کراچی کا "اردو لغت" کہیں بھی اس کی صراحت نہیں کہ "آنا" کا ماضی "آیا" ہے، محض "آتہ" یا "آ" نہیں۔ ورنہ "لکھنا" کا ماضی "لکھا" اور "مرنا" کا ماضی "مرا" کی سند پر کوئی طالب علم یہ فرض کر سکتا ہے کہ "آنا" کا ماضی بھی "اسی طرح ہوگا اور "جانا" کا ماضی بھی اسی طرح ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس جمع کی "بے قاعدہ" شکلیں بھی اسم واحد کے ساتھ درج ہونا چاہییں۔ مثلاً "چڑیا" کی جمع "چڑیوں" اور "چڑیاں" لیکن "دنیا" کی جمع "دنیاؤں" اور "دنیائیں"۔

۱۴۔ لہٰذا قواعد کی وہ تمام معلومات جو لفظ کو پہچاننے اور سمجھنے میں مدد دیں، لغت کا حصّہ ہیں۔ یعنی کامل لغت وہ ہے جس سے ہر شخص استفادہ کر سکے، جو زبان کے تمام الفاظ کو تمام ضروری معلومات کے ساتھ درج کرے۔ مولوی صاحب کا ذہن ضروری معلومات کے باب میں واضح نہیں تھا۔

اس تمہید کے بعد لغت نگاری کے بنیادی مسائل کی فہرست یوں بن سکتی ہے:

۱۔ لفظ کی تعریف متعین کرنا ضروری ہے۔ "لفظ" اور "اصطلاح" میں فرق کرنا ضروری ہے، لیکن کامل لغت میں وہ تمام اصطلاحات شامل ہونا ضروری ہیں جو زبان میں رائج ہیں۔ لسانیاتی طور پر لفظ کی تعریف ممکن نہیں، لیکن عملی طور پر "لفظ" کا اطلاق آوازوں کے ہر اس مجموعے پر ہوگا، جو کسی زبان کے حروف کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکے، اور جو اس زبان میں مستعمل ہو، خواہ وہ بمعنی یا مہمل ہی کیوں نہ ہو اور جس کی یا تو آزاد حیثیت ہو یا جو کسی اور لفظ کے ساتھ سابقہ یا لاحقہ کے طور پر استعمال ہوتا ہو۔

۲۔ یہ فیصلہ ضروری ہے کہ ان الفاظ کو کن حروف کی مدد سے ظاہر کیا جائے۔ یعنی الفاظ کے املا، تلفظ اور ان حروف کی شکلیں (کہاں پر ہائے مخلوط ہو، کہاں نہیں؛ کہاں ہمزہ ہو، کہاں نہ ہو؛ وغیرہ) متعین کی جائیں۔ اگر ایک سے زیادہ تلفظ یا املا ہو تو ان میں ترجیحات واضح کرنا ہونگی۔

۳۔ الفاظ کس ترتیب سے درج کیے جائیں؛ کن حروف کو حروف تہجی قرار دیا جائے، کن کو نہیں۔ اس کا تصفیہ زبان کی بناوٹ، رواجِ عام، منطق اور لسانیاتی پس منظر کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

۴۔ الفاظ کے معنی، مرادف اور تعریف میں فرق کیا جائے۔

۵۔ بعض الفاظ کے لیے تعریف ضروری ہے، مرادف غیر ضروری بلکہ نقصان دہ ہے۔ ایسے الفاظ کا تعیّن کر کے ان کی تعریف صحت سے کی جائے اور ان کا تعین کرنے میں غیر معمولی تفحّص کیا جائے۔

۶۔ بعض الفاظ کی تعریف ممکن نہیں، ان کے لیے معنی ضروری ہیں، بعض کے لیے معنی اور مرادف دونوں کی ضرورت ہوگی۔

۷۔ بعض الفاظ کے لیے تعریف، مرادف اور معنی تینوں ضروری ہونگے۔ ایسے الفاظ کا تعیّن بھی غیر معمولی تفحّص کا تقاضا کرتا ہے۔

۸۔ معنی بیان کرتے وقت مندرجۂ ذیل صورتوں پر غور کر کے کسی ایک کو اختیار کرنا ہوگا:

(الف) صحیح ترین معنی میں سب سے پہلے لکھیں جائیں، چاہے وہ مروّج نہ ہوں۔

(ب) قدیم ترین معنی سب سے پہلے لکھے جائیں۔
(ج) مروّج معنی سب سے پہلے لکھے جائیں۔
(د) اگر کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معنی مروّج ہیں تو (۱) قدیم ترین مروّج معنی سب سے پہلے درج ہوں (۲) جو معنی سب سے زیادہ مروّج ہوں، وہ سب سے پہلے لکھے جائیں۔ (۳) سب سے کم مروّج معنی سب سے پہلے درج ہوں (۴) فصیح ترین مروّج معنی سب سے پہلے درج ہوں۔
(ہ) صحیح ترین معنی بالکل نظر انداز کردیے جائیں اگر وہ مروّج نہیں ہیں۔
(و) صحیح ترین معنی اگر مروّج نہیں ہیں، تو ان کو (شاذ) کے ذیل میں درج کیا جائے۔
(۹) مرادفات بیان کرتے وقت مندرجۂ ذیل باتوں کا لحاظ کرنا ہوگا:
(الف) ایک لفظ کا ایک ہی مرادف لکھا جائے۔
(ب) اگر ایک لفظ کے کئی مرادف لکھنا ضروری ہیں تو بہترین یا قریب ترین مرادف پہلے لکھا جائے۔
(ج) اگر کسی مرادف کی کئی شکلیں (یعنی املا یا تلفظ) ہیں، تو ان کا بھی اندراج ضروری ہے۔
(۱۰) محاورات، ضرب الامثال اور فقرے میں فرق کرنا ہوگا۔ لغت کو محاوروں اور ضرب الامثال کا احاطہ کرنا چاہیے، فقروں کا نہیں۔
(۱۱) الفاظ کے فصیح یا غیر فصیح ہونے کا معیار متعین کرنا ہوگا (مہذب اللغات کی طرح تمام "مختص" الفاظ کو غیر فصیح قرار دینا نادانی ہے)۔
(۱۲) تذکیر یا تانیث ظاہر کرنے کے لیے جو مثالیں لائی جائیں وہ بالکل بیّن اور واضح ہوں۔ اگر کسی لفظ کو مختلف فیہ لکھنا ہے، تو دونوں طرح کی سند ضروری ہے۔
(۱۳) افعال واسماء جن کی تصریفی شکلیں قاعدہ عام کی پابندی نہیں کرتیں، ان کی تصریفی شکلیں بیان کی جائیں، لیکن صرف اسی حد تک جس کے بغیر کام نہ چل سکے۔ (کام نہ چل سکنے سے مراد یہ ہے کہ ماضی اور جمع کی معروف

اور کثیر الاستعمال شکلوں کو جانے بغیر کام نہیں چل سکتا، وہ نہ دیسی طالب علم کا نہ بدیسی طالب علم کا)۔

۱۴۔ جن الفاظ کی عربی، فارسی، دیسی، تینوں یا ان تینوں میں سے دو طرح کی جمعیں مروج ہیں، ان سب کی ایسی جمعیں ترجیحی ترتیب سے لکھی جائیں۔ (مثلاً یہ بیان کیا جائے کہ "خاتون" کی جمع "خواتین" "خاتونیں" "خاتونوں" اور "خاتونان" تینوں مروج ہیں، لیکن "خواتین" مرجح ہے)۔

۱۵۔ لاحقوں اور سابقوں کے اندراج کے مسئلے پر غور کر کے مندرجۂ ذیل میں سے ایک شکل اختیار کرنا ہوگی:

(الف) ہر لاحقے اور سابقے کا اندراج ایک بار مناسب جگہ پر کیا جائے۔ جو الفاظ ان سے بنتے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ درج کیے جائیں۔

(ب) ہر لاحقے اور سابقے کا اندراج کر کے اس کے تحت جتنے لفظ بنتے ہیں سب کو ایک جگہ درج کر دیا جائے۔

(ج) ہر لاحقے اور سابقے کا اندراج کر کے اس کے تحت جو مستقل لفظ بنے ہوں وہ لکھ دیے جائیں، باقی کو نظر انداز کر دیا جائے (مثلاً "بے" کے تحت "بے حیین" اور "بے کار" تو درج ہوں، لیکن "بے خواہش" اور "بے بیٹے" کو نظر انداز کر دیا جائے)۔

۱۶۔ حروف کے معنی اور ان کے تفاعل میں فرق کیا جائے۔ اگر کوئی حرف کسی مستقل لاحقے یا سابقے کے طور پر آتا ہے تو اس کا اندراج سابقے/لاحقے کے تحت ہو، لیکن اگر کوئی حرف بعض الفاظ میں کوئی خاص تفاعل انجام دیتا ہے، تو اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔ اور اگر ذکر کرنا ہی ہے، تو ایسے تمام حروف کا تفاعل مناسب جگہ پر بیان کرنا ہوگا۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ حروف کے وہ تفاعل جو لسانیاتی نوعیت کے ہیں (معنوی نوعیت کے نہیں) ان کو نظر انداز کیا جائے۔ مثلاً "امٹ" میں الف اور "بخدمت" میں "بے" کا تفاعل معنوی نہیں، بلکہ لسانیاتی ہے۔ یہاں نہ تو الف کے معنی نافیہ ہیں اور نہ "بے" کے معنی جاریہ۔ یہ ان حروف کے تفاعل ہیں۔

۱۷۔ غیر زبانوں کے الفاظ جو زبان کا حصہ بن گئے ہیں (یعنی بول چال میں آ گئے ہیں) انھیں لغت میں درج کرنا ہوگا، لیکن جو الفاظ حصہ نہیں بنے

ہیں (یعنی بول چال میں نہیں آئے ہیں اگرچہ ممکن ہے بعض مصنفوں نے انھیں استعمال کیا ہو) لغت میں درج نہیں ہونگے ۔

۱۸۔ کون سے الفاظ زبان کا حصّہ بن گئے ہیں (متروک، غیر متروک کی بحث نہیں متروک الفاظ بھی زبان کا حصّہ ہیں) ان کا تعیّن محض گزشتہ لغات، کتابوں، رسالوں، اخباروں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ان چیزوں کے علاوہ زبان بولنے والوں کی کثیر تعداد کی بول چال ریکارڈ کرنی ہوگی۔ پھر تمام کو کمپیوٹر کے ذریعے سے مرتّب کرنا ہوگا۔ اگر کمپیوٹر میسّر نہ ہو، تو تمام الفاظ کے کارڈ بنا کر ان کے گریڈ اور کثرتِ استعمال کا تعیّن کیا جائے ۔

۱۹۔ اگر لغت تاریخی اصول پر مرتّب کیا جا رہا ہے، تو جن الفاظ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، ان کی کثیر مثالیں مہیا کرنا فضول ہے ایسی صورت میں قدیم ترین اور جدید ترین مثال کافی ہوگی ۔

۲۰۔ تاریخی اصول پر مرتّب کیے ہوئے لغت میں لفظ کی قدیم ترین شکل کا تعین کرنے کے لیے پوری تحقیق سے کام لینا ہوگا ۔

۲۱۔ ہر اندراج اپنی جگہ پر ممکن حد تک مکمّل ہونا چاہیے ۔ "رجوع کیجیے" "دیکھیے" وغیرہ ہر اس جگہ لکھنا چاہیے، جہاں اس کی ضرورت ہو اگر ایک لفظ کے دو روپ ہیں، اور اندراج الگ الگ ہے، تو دونوں اندراجات کے ساتھ "رجوع کیجیے" وغیرہ لکھنا ضروری ہے، تاکہ ایک اندراج سے دوسرے کا تعلق فوراً واضح ہو جائے ۔

۲۲۔ بنیادی اندراج اور ذیلی اندراج کے بارے میں تصفیہ کر لینا چاہیے کہ کس طرح کے لفظ ذیلی اندراج میں ہوں گے ۔

۲۳۔ کسی لفظ کے معنی کا تعیّن کرنے کے لیے کبھی کسی ایک لغت پر اعتبار نہ کرنا چاہیے ۔

۲۴۔ لغت نگار اہلِ زبان ہو یا نہ ہو، جس زبان کا لغت وہ مرتّب کر رہا ہے، اس کو اس زبان کے ساتھ ذہنی مناسبت، طویل مزاولت اور وسیع واقفیت ضرور ہونا چاہیے۔ بہت سے "اہلِ زبان" ان خصوصیات سے عاری

دیکھے گئے ہیں۔ بلکہ "اہلِ زبان" تو اکثر ہمہ دانی کے مغالطے یا لالچ یا معصوم دھوکے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مہذب اللغات اور فرہنگ اثر کی مثال سامنے ہے،¹ لغت نگار کو علم اللسان (PHILOLOGY) لسانیات (LINGUISTICS)· اور جس زبان کا لغت وہ مرتب کر رہا ہے، اس کی قریب ترین زبانوں سے واقف ہونا چاہیے۔ اردو کی حد تک یہ زبانیں ہیں:
جدید سند آریائی اپ بھرنش بولیاں، خاص کر برج، اودھی، ہریانی اور راجستھانی؛ پھر فارسی، عربی، سنسکرت اور پنجابی۔ انگریزی کی واقفیت بھی ضروری ہے، کم سے کم اتنی کہ گلکرسٹ، فیلن، ڈنکن فوربس، شکسپیر اور پلیٹ کے اردو۔ انگریزی لغات اور شٹائنگاس (STEINGASS) اور رچائم وغیرہ کے فارسی۔ انگریزی لغات سے پورا استفادہ ممکن ہو۔

۲۵۔ ذہنی مناسبت کی پہچان یہ ہے کہ لغت نگار اصلی اور نقلی محاورے میں فرق کر سکے، اور الفاظ و محاورات کے معنی کی صحت اور رواج کے ترجیحی مدارج کے بارے میں جبلی احساس رکھتا ہو، "مستند" اور "غیر مستند" استعمال یا معنی کے تعین کے لیے اس کا طرزِ عمل و فکر تخلیقی ہو، تقلیدی اور مدرسانہ نہ ہو۔ وہ اصلی اور فرضی معنی میں فرق کر سکتا ہو، اور محض ظاہری مشابہت یا اختلاف سے دھوکا نہ کھا جائے۔

مندرجہ بالا خیالات کے پس منظر میں اردو کے تین اہم ترین لغات "آصفیہ" اور "نور اللغات" اور ترقی اردو بورڈ پاکستان کا "تاریخی اصول پر مرتب کیا ہوا" "اردو لغت" کا ایک بہت سرسری جائزہ پیش کرتا ہوں۔ چونکہ ہنوز کراچی لغت کی صرف دو جلدیں (جو "الف" اور "بے" کو محیط ہیں) دستیاب ہیں، اس لیے دوسرے دونوں لغات کے بھی صرف وہی حصے سامنے رکھتا ہوں، جو "الف" اور "بے" سے متعلق ہیں۔ میں نے اختصار کے لیے فرہنگ آصفیہ کی جگہ "آصفیہ" "نور اللغات" کی جگہ "نور" "اردو لغت: تاریخی اصول پر" کی جگہ صرف "لغت" لکھ کر کام چلایا ہے۔

¹ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، "آصفیہ" اور "نور" میں لفظ کی کوئی تعریف متعین نہیں کی گئی۔

ہے ۔ یا اگر کوئی تعریف ان کے مصنفین کے ذہن میں تھی، تو کہیں اس کی وضاحت نہیں ہے ۔ "لغت" نے اس سلسلے میں یوں لکھا ہے : " اس لغت میں اُردو کے تمام متداول متروک، نادر الاستعمال، مفرد اور مرتب الفاظ ، محاورات اور امثال درج کیے گئے ہیں، جن کا مآخذ اُردو تصانیف کے علاوہ بعض دوسری زبانوں (مثلاً فارسی وغیرہ) کی کتابیں بھی ہیں ۔ ان الفاظ میں وہ مفردات و مرکبات بھی شامل ہیں، جن میں حسب ذیل خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے : دوسری زبانوں کے ایسے دخیل الفاظ جو اُردو بول چال میں رائج ہیں یا رائج تھے، یا کم سے کم دو مصنفین نے اپنی تصانیف میں استعمال کیے ہیں ۔"

مندرجۂ بالا اقتباس شق "الف" ہے ۔ چونکہ شق "ب"، "ج" اور "د" سے مجھے کوئی اختلاف نہیں، اس لیے ان کو چھوڑ کر شق "ہ" نقل کرتا ہوں : "لگی بندھی ترکیبیں جن سے مفردات کے معنی میں اضافہ ہوتا ہے، یا جن کے اجزائے ترکیب کا مفہوم علیحدہ علیحدہ مبہم یا ناقص ہے، انھیں اصل لفظ کے بعد تابعات کے طور پر درج کیا گیا ہے ۔ جیسے "اب" کے تحت "اب کے" "اب تک" "اب جب" "اب نہ تب" یا "اب آؤ تو جاؤ کہاں" ۔"

ان عبارتوں کو پڑھ کر ناطقہ سر بگریباں ہوتا ہے ۔ تعیّن لغت کے یہ نادر طریقے زبان پر کیا ستم ڈھا رہے ہیں، اس کی وضاحت مثالوں کے بغیر بھی ہو سکتی ہے ۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اگر "آصفیہ" اور "نور" تعین لغت میں بیحد محتاط ہیں تو "لغت" بیحد غیر محتاط ہے ۔ اس کے باوجود تینوں نے بعض اہم الفاظ چھوڑ دیے ہیں ؛ اور "لغت" نے غیر ضروری الفاظ کی (یعنی ایسے الفاظ کی، جو اُردو کے لفظ ہی نہیں ہیں، یا لغت میں مستقل اندراج کے لائق نہیں ہیں) بھرمار کر دی ہے ۔

"الف" کے ذیل میں "آصفیہ" نے عربی فارسی میں الف کے تفاعل کی تفصیل مزا لے کر بیان کی ہے ۔ بعد میں "الف" کے ان تمام تفاعلات کا ذکر کیا ہے، جو دیسی الفاظ میں وارد ہوتے ہیں ۔ وہ خود لکھتے ہیں : "جس طرح عربی فارسی کا الف مختلف مقاموں پر مختلف کام دیتا ہے ۔ اس طرح یہ بھی کبھی نفی کے لیے آتا ہے ۔" اور "نور" نے بھی ان کے اتباع میں تقریباً وہی تفصیلات بیان کی ہیں اور لکھا ہے : " یہ الف

مختلف مقامات پر مختلف کام دیتا ہے۔" دونوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کسی حرف کا کوئی کام دینا اس کو بامعنی (یا بمعنی) لفظ کا (یعنی ایسے لفظ کا، جسے لغت کا درجہ دیا جاسکے)، مقام نہیں دے سکتا۔ مگر انھوں نے اتنی احتیاط سے کام ضرور لیا کہ "کام دیتا ہے" کا فقرہ استعمال کیا۔ "لغت میں درج ہے کہ یہ "حروف علت مقصورہ ہے، کبھی الفاظ کے شروع میں، جیسے اَب، اِدھر، اُدھر، اَولا، اَوگھٹ، اُوپر، ایمن، ایمان، اِفادہ، کبھی درمیان یا آخر میں، جیسے، کار، جا۔ البتہ عربی سے ماخوذ بعض الفاظ میں درمیانِ کلمہ تلفظ مختلف ہوتا ہے، جیسے جرأت، تأثر، تأمل "۔ اس عجیب و غریب تحریر کا تجزیہ میرے بس کا نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ الفاظ کے شروع، درمیان اور آخر کے علاوہ اور کون سی جگہ ہے جہاں "الف" یا کوئی اور حرف وارد ہوتا ہے؟ اس تفصیل کی کیا ضرورت تھی؟ "ڑ" کے علاوہ اردو کا کون سا ایسا حرف ہے جو شروع، درمیان اور آخر، تینوں جگہ نہیں آتا؟ لغت کے مرتبین نے اپنی فہرست حروف تہجّی میں لھ، مھ، نھ وغیرہ کو شامل کیا ہے کہ اگرچہ یہ لفظ کے شروع میں نہیں آتے، لیکن ان کی اپنی مستقل صوتی حیثیت ہے۔ ہوگی۔ لیکن اردو کے حروفِ تہجّی میں انھیں شامل کرنے کا کون سا جواز ہے؟ ہر زبان میں ایسی آوازیں ہیں جو صوتی شخصیت رکھتی ہیں، لیکن لفظ کے شروع میں نہیں آتی۔ یا لفظ کے شروع میں آتی بھی ہیں، تو اس آواز کے ساتھ نہیں جو تہجّی کی حیثیت سے ان کی آواز ہے، پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ حروفِ تہجّی کی تعداد کو زیادہ کرنا الجھنوں کو اور الجھانا ہے! حروفِ تہجّی کی پہچان یہی ہے کہ لفظ کے شروع، وسط، آخر کہیں بھی آسکتا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات بیان کرکے ضخامت میں اضافہ کرنا تو ممکن ہے، لیکن علمیت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ پھر لفظ کے شروع میں آنے والے "الف" کی مثال میں تو کئی لفظ دیے گئے ہیں، درمیان اور آخر کے لیے ایک ہی ایک لفظ پر اکتفا کی گئی ہے۔ یہ اشرفیوں کی لوٹ اور کوئلوں پر مہر کیوں؟ اور "ایمان"، "افادہ" میں تو الف بیچ میں بھی آتا ہے، ان الفاظ کو محض آغازی "الف" کی مثال میں رکھ کر الجھن پیدا کرنا کیا ضرور تھا؟ ان سب پر یہ طرّہ کہ "عربی سے ماخوذ بعض الفاظ میں درمیان کلمہ تلفظ

مختلف ہوتا ہے؟ اس عبارت میں ”کلمہ“ کا لفظ لا کر ایک اور الجھن ڈال دی کہ بات تو الفاظ کی ہو رہی تھی، یہ کلمہ کہاں سے آ پڑا؟ اور جرأت، تامّل، تاثر، وغیرہ میں ”الف کا تلفظ اَب“، ”اگر“، ”اَکم“ جیسے الفاظ کے ”الف“ سے کس طرح مختلف ہے؟ ”لغت“ کے مرتبین نے ”تامّل“ اور ”تاثر“ پر ہمزہ نہ دے کر اور جرأت پر ہمزہ دے کر اور ستم کیا ہے۔ بیچارہ پڑھنے والا سمجھے گا کہ ”جرأت“ کے ”الف“ کا تلفظ کچھ اور ہوگا، ”تامّل“ اور ”تاثر“ کے الف کا تلفظ کچھ اور۔ لیکن اسے یہ اطلاع کہیں نہیں دی گئی کہ ”جرأت“، ”تامّل“، ”تاثر“ وغیرہ میں ”الف“ کا تلفظ کس طرح کیا جائے۔ ایک ظلم تو یہ کیا کہ جہاں اختلاف نہیں تھا، وہاں اختلاف کا تذکرہ کیا؛ پھر گھپلا یہ کر دیا کہ اس اختلاف کی تفصیل بھی نہیں بیان کی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ”الف“ کا اندراج الگ کیا ہے اور تقریباً تین کالم میں بطور سابقہ بالاحقہ اس کے تفاعل بیان کیے ہیں۔ زیادتی کے لیے سنسکرت کا اور تفصیل کے لیے عربی کا ”الف“، سب الف زبر کے معنی کے ذیل میں لکھے گئے ہیں۔ اور اگر یہ تمام تفصیل بیان کرنا تھی، تو ”الف“ کا سب سے زیادہ پریشان کن تفاعل (یا ان تینوں کے نزدیک ”الف“ کے معنی) یعنی ”الف زائدہ“ کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ ”آصفیہ“ نے اس پر مفصل نقشے بنائے ہیں لیکن مشہور اور اکثر استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً ”افسوں، افسانہ، اشتر، اگر“ وغیرہ کو بھول گئے ہیں۔ ”نور“ نے صرف ”اگر“ اور ”اشتر“ پر اکتفا کی ہے لیکن اتنا لکھ دیا ہے کہ اردو میں ”اگر“ فصیح ہے۔ ”لغت“ بیچاری ”الف زائد“ کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ ”افسانہ“، ”افسوں“، ”اشتر“، ”اگر“، ”افغان“، ”افگار“، ”اسکندر“، ”اشکم“ جیسے درجنوں الفاظ اردو کے طالب علم کے لیے پریشانی پیدا کرتے ہیں۔ جہاں ارباب لغت نے الف کے تفاعل (یا ان کے خیال میں معنی) کی بعض نہایت نادر مثالیں درج کی ہیں (مثلاً ”الف تشدیدی“ سنسکرت الفاظ میں جیسے ”چپل“ سے ”اچپل“ یعنی ”بہت شوخ“) وہیں ”الف زائد“ کا ذکر بھی کر دیتے تو ان کا کیا بگڑتا، بلکہ تشنگان کا بھلا ہوتا۔ ”اچپل“ کے ”الف“ کے اندراج کر کے انھوں نے مزید غلط فہمی یہ پھیلائی ہے کہ اس طرح کے الفاظ بہت سے ہیں۔ حال آں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے

الفاظ بہت ہی کم ہیں، اور "افسانہ" "افسوں" قسم کے الفاظ کے مقابلے میں تو معدوم ہیں۔ (اب یہ الگ بحث ہے کہ "افسانہ" وغیرہ میں "الف" زائد ہے، یا اصل لفظ "افسانہ" وغیرہ ہی ہیں اور "الف" ان کا ساقط ہو گیا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ الگ الگ الفاظ میں الگ الگ صورتیں ہیں، اور بعض ہم معنی اصلی لفظ مع الف اور بے الف سبھی ہیں مثلاً "سوار" اور "اسوار"۔ "نور" نے "اسوار" کا مخفف "سوار" لکھا ہے جو بالکل غلط ہے۔ "آصفیہ" نے "اسوار" درج کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ "لغت" نے "اسوار" کا الگ لغت قائم کر کے معنی "سوار" دیے ہیں لیکن اس کی اصل یہ بیان کی ہے کہ یہ "اشو" اور "ار" کا مرکب ہے۔ "بہارِ عجم" میں لکھا ہے کہ یہ لفظ در اصل ہندی (یعنی سنسکرت) "اسوار دودھ" سے بنا ہے۔ "برہانِ قاطع" اس کو "سوار" کے معنی میں کم و بیش اصطلاحی لفظ بھی بتاتی ہے۔ اربابِ لغت کو مزید تحقیق ضروری تھی۔

حرفوں کو لفظ فرض کرنے کا یہ شوق صاحبانِ "لغت" کو اس قدر ہے کہ "بہ خدا" "بہ ایں لحاظ" "بہ اجلاس" "بہ خیریت" "بہ اقساط" جیسے الفاظ کو "بخدا" "بایں ہمہ" وغیرہ لکھ کر "ب" کے معنی بیان کیے ہیں کہ یہ فارسی حرف اردو میں "ساتھ میں" "جانب" وغیرہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ صاحبانِ "لغت" کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ ان سب الفاظ میں "ب" بمعنی ہے، یہ در اصل "با" یا "بہ" کا مخفف ہے۔ "بہارِ عجم" نے بائے موحدہ اور "با" دونوں کو ایک ہی بنایا ہے۔ لیکن اردو میں یہ صورت نہیں۔ خود انھوں نے "باعلان" کی سند میں مومن کا جو شعر دیا ہے اس میں بھی "بہ اعلان" الگ الگ لکھا ہوا ہے (جلد دوم صفحہ ۴۸۰)

یہ بات اس شقی نے بہ اعلان جب کہی
ابنِ حسن میں تابِ خموشی نہ پھر رہی

حد یہ ہے کہ "بپا" کا اندراج بھی کر دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ در اصل "برپا" ہے۔ اب بیچارہ طالب علم کہاں جائے؟ اس کو بتا رہے ہیں کہ "ب" مجرد اتنے بہت سے معنی دیتی ہے اور مثال میں "بپا" بھی ڈال کر لکھ رہے ہیں کہ یہ "ب" مجرد والی نہیں ہے۔ اور لکھنا کہ یہ "ب" "فارسی حرف" ہے لیکن "اردو" میں فلاں فلاں

معنی دیتا ہے، عجیب و غریب بات ہے۔ یعنی "ب" اردو کا حرف ہے بھی اور نہیں بھی۔ اور حرف تو فارسی کا ہے لیکن اردو میں اس کے فلاں فلاں معنی ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ بائے قسم کو بھی فارسی حرف بنا دیا۔ خدا معلوم "باللہ" اور "ربّ تعجبّ" کی "ب" فارسی کب سے ہوگئی! اگر لکھنے ہی کا شوق تھا تو یہ لکھ دیتے کہ بہت سے الفاظ میں فارسی "با" یا "بہ" کی جگہ محض "ب" اردو فارسی میں آئی ہے، اور بہت سے الفاظ فارسی میں غیر ٹکسالی ہیں، لیکن اردو میں "با" یا "بہ" یا "بر" کو مخفف کر کے محض "ب" کے ساتھ بنا لیے گئے ہیں" ان کے اندراجات مناسب جگہ پر مل جائینگے۔ حروف کو لفظ فرض کرنے کا شوق ایسا ہی رہا، تو مجھے یقین ہے ارباب "لغت" نکھو، بچھوڑو، بگرو، نگفتہ، میں بھی "ن" کو لفظ فرض کرلینگے اور کہینگے کہ یہ حرف فارسی کا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی نفی کے ہوتے ہیں۔

"نور" اور "آصفیہ" نے الفاظ کو لغت کیوں قرار دیا ہے، اس کی وضاحت انھوں نے کی ہے۔ لیکن جو لغات انھوں نے درج نہیں کیے ہیں (تقطیع "ب") ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

آصفیہ: اب تب کرنا، اب تک لگنا، اب نہ تب، اب کا، اب نہیں، اب اب کرنا
اب کیا پوچھنا ہے۔

نور: اب تب لگنا، اب اب کرنا، اب کیا پوچھنا ہے۔

ان کے برخلاف ارباب "لغت" نے "اب" کی تقطیع میں لفظ نافہمی کے وہ ثبوت دیے ہیں کہ باید و شاید۔ "اب" کے چند معنی ملاحظہ ہوں:

(۱) ان دنوں، آج کل، اس دور میں، اس زمانے میں، اس زندگی میں"۔ "ان دنوں" اور "آج کل" بالکل ہم معنی ہیں۔ اسی طرح "اس دور میں" اور "اس زمانے میں" بالکل ہم معنی ہیں۔ ان ازدواج کی کیا ضرورت تھی؟ "اس زندگی میں" کا مفہوم "اب" سے کس طرح برآمد ہوتا ہے، اس کے لیے ذوق کا شعر نقل کیا ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے الخ

اگر یہاں "اب" کے معنی "اس زندگی میں" ہیں تو میر کے اس شعر میں بھی اسی معنی میں ہونا چاہیے، جو "اس نوبت" "اس مرحلے پر" کے تحت نقل کیا گیا ہے۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ظاہر ہے کہ دونوں جگہ "اب" کے معنی متحد ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں اس کے معنی ہیں، "اس حالت میں" "اس صورت میں"؛ یہاں نہ مرحلے کا چکر ہے نہ زندگی کا۔ اگر اس کا ثبوت دیکھنا ہو تو میر کے یہاں بھی "اب" کے بعد "تو" لگا کر دیکھ لیجیے۔ "نور" میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ کبھی کبھی "اب" کے بعد "تو" زائد اور حسن کلام کے لیے آتا ہے، مطلب "اب" سے ادا ہو جاتا ہے۔ ذوق اور میر کے یہاں بھی یہی صورت ہے، مفہوم نہ زندگی کا ہے، نہ "نوبت" وغیرہ کا۔ محض "اس صورت میں" "اس حالت میں" کا مفہوم ہے۔ لیکن ارباب لغت کو تو فہرست معانی میں اضافہ کرنے کی غرض ہے۔ اور فہرست الفاظ میں کثرت کا شوق۔ اور دیکھیے:

(۲) آیندہ، مستقبل میں۔

صاف ظاہر ہے کہ "آیندہ" اور چیز ہے اور "مستقبل" اور چیز ہے۔ کیوں کہ "آیندہ" کے اور معنی بھی ہیں، جو مستقبل کے نہیں ہیں (مثلاً آپ کہتے ہیں: آیندہ اوراق میں اس کی تفصیل ملیگی)۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ "اب" کے معنی میں "آیندہ" کے یہ معنی شامل نہیں ہیں۔ یہاں "آیندہ" لکھ کر ارباب لغت نے طالب علم پر ظلم شدید کیا ہے۔ پھر مومن کا شعر نقل کرتے ہیں:

اب اور سے لو لگائینگے ہم
جوں شمع تجھے جلائینگے ہم

تعجب ہے کہ ارباب لغت نے یہ نہ دیکھا کہ یہاں "اب" کے معنی "آیندہ" یا "مستقبل میں" نہیں ہیں۔ بلکہ "آج سے" "اس وقت سے" کے ہیں۔ "مستقبل میں" "اب" کے لیے مومن ہی کا ایک شعر ارباب لغت نے نقل کیا ہے، لیکن معنی یوں لکھے ہیں:

(۳) دوبارہ، مکرّر۔

یہاں بھی وہی گھپلا ہے "دوبارہ" یا "مکرّر" میں سے ایک کافی تھا۔ شعر ہے:

بت خانہ، چھیں تہی ترا گھر
مومن ہیں تو اب نہ آئینگے ہم

"نور" نے اس شعر کو "آیندہ" کے معنی کی سند کے طور پر پیش کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ "دوبارہ" کے معنی میں "اب" قطعی غلط ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے "پھر کبھی" کے معنی میں لیا جا سکتا ہے۔ "نور" نے یہ معنی درج بھی کیے ہیں لیکن "لغت" میں "پھر کبھی" کا ذکر نہیں۔

اگر "آصفیہ" کو لغات ترک کرنے کا شوق ہے، تو "نور" کو کثرت کی تلاش ہے۔ انصاف کی کہیے تو "نور" نے بیشتر وہی الفاظ درج کیے ہیں جو واقعی لغت کا درجہ پانے کے مستحق ہیں۔ لیکن کثرت کا شوق قلت کے شوق سے کم معیوب نہیں، بلکہ زیادہ ہی ہے۔ کیونکہ اس سے زبان کے بارے میں بالکل غلط اور لاحاصل تصورات کو راہ ملتی ہے۔ چنانچہ "نور" نے "اب جاگے" کا لغت قائم کر کے معنی بیان کیے ہیں "اب ہوش میں آئے۔ بہت دیر بعد چیتے"۔ حال آں کہ ظاہر ہے کہ اس محاورے میں "اب" کے کوئی خاص معنی نہیں ہیں، محاورہ "جاگے" کے استعاراتی معنی پر قائم ہے۔ "اب جاگے" میں "اب" کی جگہ "تب"، "پھر"، "کب" رکھ دیجیے "جاگے" کا مفہوم وہی رہتا ہے، یعنی ہوش میں آئے۔ "اب" کے بجائے اس محاورہ کو "جاگے" کی تقطیع میں آنا چاہیے تھا۔

اسی طرح "اب پھنسے" کا لغت قائم کر کے "نور" میں معنی درج ہیں: "عنقریب دام میں پھنسے گا"، یہاں بھی ظاہر ہے کہ "اب" کے معنی معمولہ ہیں یعنی "تھوڑی ہی دیر میں"۔ لیکن "پھنسے" میں محض مضارع کا مفہوم ہے۔ اس کی جگہ کچھ بھی رکھ دیجیے: "اب گرا" "اب مرا" "اب گیا" وغیرہ تو بھی "اب" کا مفہوم قائم رہتا ہے۔ "نور" کو چاہیے تھا کہ "اب" کے معنی "عن قریب" درج کر کے داغ کا وہ شعر لکھتے، جو انھوں نے "اب پھنسے" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ "لغت" میں "اب" کے معنی "عنقریب" بالکل صحیح درج ہیں، لیکن کثرت الفاظ کا ہوکا ویسا ہی ہے۔

(۴) اگلے ہی لمحے (یا لمحات) میں، بہت جلد، ابھی، عنقریب۔

بس عنقریب کافی تھا، لیکن ارباب "لغت" کی ایک لفظ سے تسلّی کہاں ہوتی ہے! اور یہ بھی نہیں کہ مرادفات کے اس ڈھیر میں کوئی ترجیحی درجہ بندی بھی ہو۔ بس یوں ہی لکھ دیا ہے۔ لغت نگاری آخر الفاظ ہی کو تو جمع کرنے کا نام ہے۔

اربابِ"لغت" نے کہا ہے کہ انھوں نے کوئی لفظ خود سے ایجاد نہیں کیا، کیوں کہ لغت نگار کا منصب وضعِ الفاظ نہیں ہے۔ یہ بہت احسن اصول ہے، لیکن وضعِ الفاظ سے پرہیز کرنے کے ساتھ لغت نگار کو صحتِ الفاظ کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ اربابِ"لغت" کا یہ عالم ہے کہ تحقیق کی جگہ حسنِ اعتقاد سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل لغت بھی قائم کیا ہے۔

اب جب: تامل، التوا، ٹال مٹول۔

اوّل تو اسی پر حیرت ہے کہ کیا کسی لفظ کے معنی "تامل" اور "التوا" دونوں ہو سکتے ہیں۔ خیر، ممکن ہے۔ لیکن سند میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) شاعر ہو، مت چپکے رہو، اب جب میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو، ابیات پڑھو، کچھ بیتیں ہم کو بتلاتے رہو (میر)

(۲) اب جب سب واہیات، لڑنے کے لیے کوئی ساعت نکلوائی جاتی ہے۔ (افسانچے)

میر کا یہ شعر دیوان پنجم میں ہے۔ اربابِ"لغت" نے کلیات کے کسی ایڈیشن کے صفحہ ۸۰۵ کا حوالہ دے کر نقل کیا ہے۔ ۱۸۱۱ کے کلیات ۱۶۸۱ اور ظلِ عباس عباسی کے کلیات (دلی، ۱۹۶۸ء) میں، جو ۱۸۱۱ء پر مبنی ہے، شعر یوں درج ہے (۷۴۸)

شاعر ہو مت چپکے رہو، اب چپ میں جانیں جاتی ہیں الخ

نول کشور کا ۱۸۶۸ ابھی میرے سامنے ہے۔ اس میں بھی (صفحہ ۷۴۵) "اب جب میں" کی جگہ "اب چپ میں" بالکل صاف لکھا ہے۔ "اب جب" کی جگہ "اب چپ" کس قدر مناسب ہے، یہ کہنے کی حاجت نہیں۔ "اب جب" سے تو کوئی مطلب نہیں نکلتا، لیکن اگر "التوا" "ٹال مٹول" ہی کا مفہوم شاعر کے مدِّنظر ہوتا تو وہ آسانی سے "اب تب" کہہ سکتا تھا۔ خود "لغت" میں "اب تب" کے معنی "ٹال مٹول" درج ہیں۔ "تامل" کا تو خیر کہیں سے کوئی محل ہی نہیں، "ٹال مٹول" کے معنی میں "اب جب" کو تسلیم کر لیا جاتا، اگر میر نے ایسے ہی لکھا ہوتا۔ لیکن "اربابِ لغت" نے شاید جلدی میں "چپ" کو "جب" پڑھ لیا۔ پھر مزید تحقیق کی تو افسانچے سے ایک جملہ برآمد کیا، جس کا مطلب میری سمجھ سے باہر ہے۔ (اب جب، سب واہیات" خدا جانے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کتاب میرے سامنے نہیں، لیکن میر کی سند غلط ثابت ہونے کے بعد "اب جب"، بمعنی "تامل" وغیرہ میں، مجھے سخت

تامل ہے۔

اردو الفاظ کو لغت قرار دینے میں "آصفیہ" خاصی کنجوس ہے، لیکن انگریزی الفاظ میں اتنا تکلف نہیں برتا گیا ہے۔ اس سے زیادہ بے اصولاپن کیا ہوگا کہ "اہا" کی دوسری اور اتنی ہی معروف شکل "آہا" نہ دی جائے، لیکن "اسکالرشپ"، "اسکول ماسٹر"، "اسپرٹ" (بمعنی "جوش، دلولہ، جوہر" (یہ سب معنی اُردو میں نہیں ہیں) "اسپیکر" بمعنی "مقرر، تقریر کرنے والا۔ (یہ معنی بھی اُردو میں نہیں ہیں) "اسٹوڈنٹ" وغیرہ دھڑلے سے درج ہوں۔ "اسکالرشپ" کی جگہ "وظیفہ" عرصے سے مستعمل ہے، ممکن ہے "آصفیہ" کے زمانے میں نہ رہا ہو۔ لیکن "اسکول ماسٹر" کبھی اردو نہیں مانا گیا۔ "ماسٹر" "ماسٹر صاحب" البتہ اردو ہیں۔ "ماسٹر جی" بھی اردو ہے۔ "اسپرٹ" اور "اسپیکر" محض مخصوص معنوں میں اردو ہیں۔ (اسپرٹ" بمعنی الکوہل یا الکحل اور "اسپیکر" بمعنی اسمبلی یا پارلیمنٹ کا اسپیکر) ان کے علاوہ کوئی اور معنی دینا زیادتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ "اسٹاف" نہیں درج کیا، جو "اسکول ماسٹر" کے مقابلے میں بہت زیادہ اردو ہے "آصفیہ" نے آزمائش لکھا ہے (مع ہمزہ اور یائے تحتانی کے) لیکن "آزمایشی" چھوڑ دیا ہے۔ اس کو اردو الفاظ سے زیادہ غیر اُردو الفاظ بہت پسند ہیں۔ چنانچہ ہندی الفاظ بھی خوب درج کیے گئے ہیں (مثلاً "برکھ" بمعنی "بیل"، "مرگا"، "بھجا" بمعنی بازو، مثلث کا ضلع، "برہسپت" بمعنی "عالم فاضل وغیرہ) "نور" میں "اہا" اور "آہا" دونوں درج ہیں، لیکن "اہا" بمعنی کلمۂ ماتم نہیں دیا ہے۔ ہندی اور انگریزی الفاظ کے سلسلے میں "نور" زیادہ محتاط ہے۔ اگرچہ اس میں "اسپیکر" (بمعنی تقریر کرنے والا" جو بالکل غلط ہے) درج ہے (آصفیہ نے کم سے کم ایک معنی تو صحیح لکھے تھے، یعنی "پارلیمنٹ کا اسپیکر") لیکن "اسکالرشپ"، "اسکول ماسٹر"، "اسٹوڈنٹ" وغیرہ درج نہیں ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس احتیاط میں "اسٹیشن ماسٹر" بھی نظر انداز ہو گیا ہے "برکھ"، "برہسپت" (بمعنی "عالم، فاضل) درج نہیں ہیں، لیکن "بھجا" بمعنی "مثلث کا ضلع" (جو اردو میں قطعی نہیں ہے) لکھا ہوا ہے۔

القصہ تعیینِ لغت میں "آصفیہ" اور "نور" دونوں جگہ جگہ بے اصولے پن سے کام لیتے ہیں۔ ارباب لغت نے اصول قائم کیے ہیں، لیکن ان کے اصول "آصفیہ"

اور "نور" کے بے اصولے پن سے بدتر ہیں۔ جیسا کہ میں اوپر اقتباس میں درج کر چکا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے تمام متداول اور نادر الفاظ شامل کیے ہیں، وہ الفاظ بھی شامل کیے ہیں، جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں، لیکن رائج تھے، یا رائج ہیں، یا کم سے کم دو مصنفوں نے استعمال کیے ہیں۔ مآخذ میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ (چنانچہ بعض الفاظ کی سند ابوالفضل وغیرہ سے دی گئی ہے) اس کارروائی کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ایں چہ بوالعجبیست! اگر اردو کا لفظ ہے، تو اردو میں کہیں تو استعمال ہوا ہوگا، اگر نہیں تو اس کا اردو ہونا مشکوک ہے۔ یہ تو یوں ہوا کہ انگریزی کے لغت میں لفظ "غزل" درج کیا جائے اور سند دی جائے کسی ایسے مصنف کی جس نے غزل پر انگریزی میں مضمون لکھا ہو۔

متداول اور نادر الفاظ بالکل ٹھیک، لیکن "لفظ" کی تعریف واضح نہیں ہوئی اور یہ "ڈنڈا" اچھالا کر کہ کسی لفظ کو کم سے کم دو مصنفوں نے استعمال کیا ہو تب ہم غیر زبان کا لفظ اردو میں لغت کے طور پر قائم کریں گے، وہ دھاندلی کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ "ان ورسری" (یہ انگریزی لفظ "اینی ورسری" ANNIV-ERSARY کا غلط تلفظ ہے۔ سند صرف ایک لائے ہیں، "سیرۃ النبی" کی۔ "ایوننگ پارٹی" یہاں بھی سند ایک ہی ہے، "حیات شبلی"۔ "امپیلی فائر" یہاں بھی سند ایک ہی ہے، کسی کتاب بنام "آواز" کی جس کی تاریخ ۱۹۶۷ درج ہے۔ "ایمری" (یہ انگریزی لفظ EMERY کا غلط تلفظ ہے) معنی بھی درست نہیں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں: "ایک سخت دھات جو پالش کے لیے استعمال کی جاتی ہے"۔ سبحان اللہ! حقیقت یہ ہے کہ ایک طرح کا پتھر ہوتا ہے۔ مانک سے مشابہ، اسے ہندی اور اردو میں "کرنڈ" کہتے ہیں۔ EMERY اس کی ایک قسم ہے۔ امری یا ایمری اردو میں کبھی دخیل نہیں ہوا۔ سند صرف ایک دی ہے، ۱۹۳۳ کی۔ "امری" کے معنی ریگ مال، یعنی SANDPAPER بھی غلط درج ہیں۔ "ارباب لغت" نے معمولی تحقیق بھی گوارا نہیں کی۔ "ارباب لغت" کی ذہنیت کہیں تو اس قدر معصوم ہے کہ وہ کسی لفظ کو کہیں دیکھ لیتے ہیں تو اسے جھٹ اپنے لغت میں

درج کر لیتے ہیں، اور کہیں اس قدر محتاط کہ اصلی اور واقعی لغات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کے سلسلے میں یہ دونوں طرح کی حرکتیں ان سے جا بجا ہوئی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے "آل رائٹ" جیسا انگریزی لفظ بھی اردو فرض کر لیا ہے اور سند کے لیے جو عبارت لائے ہیں وہ مکالمہ ہے:

"آل رائٹ" ٹھیک ہے۔ بہت ٹھیک ہے، نہایت خوب

بلمپ بولا۔ آل رائٹ تم ایک پلس ہو گئے تم لائم جوس پی سکتے ہو۔

۱۹۷۵ (بسلامت روی)

ان کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ مکالمہ میں، بولنے والے کے اصل لفظ درج کرنے کی روایت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مکالمے میں آنے والا لفظ خود بخود لغت بن جاتا ہے۔ انگریزوں کی زبان سے جو مکالمے کہلائے جاتے ہیں، ان میں اکثر ہماری مصنفوں نے "ویل" (WELL) "ٹم" (تم)، "مانگٹا (مانگتا)، "ام" (ہم)، ڈیم فول (DAMNED FOOL) وغیرہ اور دیہاتیوں کی زبان سے جو مکالمے ادا کرائے جاتے ہیں، ان میں "اِجّت" (عزّت)، "ہجور" (حضور)، "پھائدہ" (فائدہ) وغیرہ الفاظ بھی ہیں۔ یقین ہے کہ ارباب "لغت" ان کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دے کر اس کی زینت بڑھائیں گے۔ "بسلامت روی" کا اقتباس جو انھوں نے نقل کیا ہے، صاف صاف مکالمہ ہے بلمپ بولا: آل رائٹ) اس کو لغت بنانا انتہائی درجہ کی معصومیت ہے۔ تعجب ہے انھوں نے "ام" کی تقطیع میں اس کے معنی "ہم" نہیں درج کیے (ناول نگاروں کے یہاں درجنوں انگریزوں کی زبان سے "ہم" کی جگہ ام کہلایا گیا ہے۔) انگریزی لفظ ناشناسی کی ایسی ہی مثال ارباب "لغت" نے لفظ "بابا" کے تحت بھی پیش کی ہے۔ ایک معنی یوں بیان کیے ہیں:

(۲) وہ لفظ جس سے انگریزی راج میں انگریزوں کے شاگرد پیشہ اپنے آقاؤں کے بچوں کو مخاطب کرتے ہیں۔

کلکٹر ۱۸۵۸ .... میم صاحب و بابا صاحب (سرکشی ضلع بجنور)

لیکن آگے یہ بھی ہے:

بیٹا، بیٹی یا خود سے (باپ یا کسی بزرگ کا حرفِ خطاب)

باپ نے کہا، اے بابا، مجھے تیری قدرت کا حال بہ خوبی معلوم ہے۔
(بستان حکمت) ۱۸۳۸

انھوں نے یہاں بھی وہی گھپلا کیا۔ "بابا" مجرد طور پر انگریزی راج میں..... آقاؤں کے بچوں کے لیے نہیں آتا۔ "نور" نے لکھا ہے کہ انگریزوں کے بچوں کے لیے لفظ "بابا لوگ" استعمال ہوتا ہے، اور اس معنی میں یہ انگریزی لفظ BABY کا مہند ہے۔ نور کے زمانے میں تو انگریز حاکم موجود تھے، لہٰذا انھوں نے انگریزوں کے بچوں کا ذکر کیا تو غلط نہ کیا۔ "لغت" کے زمانے میں انگریز ہندستان میں حاکم ہیں نہ پاکستان میں، لیکن یہ لفظ نیچے طبقے کے لوگوں کی زبانوں پر اب بھی اسی معنی میں (یعنی آقاؤں یا افسروں کے بچوں کے معنی میں) مروج ہے۔ پھر ارباب "لغت"، اسے "انگریزی راج میں انگریزوں کے شاگرد پیشہ" سے کیوں مختص کرتے ہیں) غیاث احمد گدی کا مشہور افسانہ "بابا لوگ" تو انگریزی راج کے مٹنے کے بہت بعد کا ہے اسی کا حوالہ کافی تھا۔ پھر "بابا" بطور حرف خطاب کے لیے بستان حکمت سے بہت پہلے کی سند میر کے یہاں موجود ہے:

میر فقیر ہوئے تو اک دن کیا کہتے ہیں بیٹے سے
عمر رہی ہے تھوڑی اسے اب کیوں کر کاٹیں بابا ہم
۱۸۱۱
(دیوان چہارم (کلیات ۵۷۷، فورٹ ولیم

میر کا یہ دیوان یقیناً ۱۸۰۰ء سے پہلے مرتب ہو چکا تھا، لیکن ان کی تاریخ وفات (۱۸۱۰) ہی سے استناد کیا جائے تو بھی اس لفظ میں عمر ۲۸ سال زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور جو معنی ارباب "لغت" نے درج کیے ہیں، ان کی وضاحت اس شعر سے جتنی خوبی سے ہوتی ہے، اتنی خوبی سے ان کی مثال کے ذریعے نہیں ہوتی، کیوں کہ یہاں صاف ذکر ہے کہ قائل نے اپنے بیٹے سے کہا؛ "لغت" کے اقتباس میں یہ عبارت واضح نہیں ہے

ایک اور اندراج دیکھیے: "ایمفی تھیٹر" یہ خدا معلوم کب اور کیوں کر اردو کا لفظ ہو گیا! پھر معنی بھی غلط دیے ہیں۔ لکھا ہے: "گول دائرے میں بنا ہوا (کذا) مسقف ہال"! یہ گول دائرہ بھی خوب رہی، شاید چوکور دائرہ بھی ہوتا ہے! اور ایمفی تھیٹر نہ دائرے

میں بنا ہوتا ہے، نہ مسقّف ہوتا ہے، نہ ہال ہوتا ہے۔ یہ تو کھلی ہوا کا تھیٹر ہوتا ہے، عام طور پر نعل اسپ یا نیم دائرے کی شکل میں، بیچ کی جگہ ہمیشہ خالی یعنی بے چھت کی ہوتی ہے سامعین کی نشستیں بھی اکثر بے چھت کی ہوتی ہیں۔ سب معنی مہمل لکھ دیے اور ظلم پر ظلم یہ کیا کہ جو شعر سند میں لائے ہیں، اس میں "ایمفی" کی جگہ "امفی" یعنی فاعلن کی جگہ فعلن موزوں ہوا ہے۔ سب بات ہی چوپٹ ہو گئی۔ اگر اس لفظ کو لغت بنانا ہی تھا تو "الف میم" کی تقطیع میں لگاتے، نہ کہ "الف ے م" کی تقطیع میں شعر یوں ہے:

چھوٹی سی ریل کا خود دوڑنا جیسے جیسے
۱۹۰۶ اور وہ ایک طرف سامنے ایمفی تھیٹر (ترونشتر)

ممکن ہے "ایمفی تھیٹر" "جیسا لفظ" یا "ایبی ورسری" وغیرہ قبیل کے الفاظ چالیس پچاس برس پہلے مروّج رہے ہوں، (مجھے اس میں شبہہ ہے)، لیکن اس زمانے میں تو یہ الفاظ اردو ہرگز نہیں۔ اگر انھیں درج کرنا ہی تھا، تو صاف لکھ دینا تھا کہ متروک ہیں۔ لیکن متروکات کے بارے میں اربابِ "لغت" نے اپنا ایک نظریہ پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

> کسی لفظ کے متعلق متروک یا شاذ ہونے کا اشارہ نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بات کہ لفظ متروک ہے یا نہیں، اس کے استعمال کی مثالوں کے قدیم و جدید ہونے سے اخذ کی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جدید دور کے بہت سے علمائے ادب عموماً اور راقم الحروف اور رفقا خصوصاً ترکِ الفاظ کے حق میں نہیں ہیں، کیوں کہ اس سے زبان کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔

اس چھوٹی سی عبارت میں بھی اس قدر گھپلے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ چلیے، کسی لفظ کے متروک ہونے کے بارے میں اطلاع اس کے استعمال کی مثالوں کے قدیم و جدید ہونے سے اخذ ہو سکتی ہو گی! لیکن یہ اطلاع کہاں سے اخذ ہو گی کہ یہ لفظ شاذ ہے؟ اربابِ "لغت" نو "اسپوک" (SPOKE) اور "اسپون" جیسے قطعاً غیر اردو الفاظ کی مثال (اسپوک بمعنی "لوہے کی تیلی" "سینک"، ۱۹۴۴ء اور اسپون بمعنی "چمچہ" ۱۸۸۹ء)

لکھ کر جھوٹے جھامتے نکل گئے، (اسپوک کے معنی بھی بالکل غلط لکھے ہیں) اب مجھے کون بتائے کہ یہ لفظ شاذ ہیں کہ نہیں؟ اور جب میں ۱۸۸۹ سے بھی پہلے کے ہزار ہا الفاظ و محاورات کو اب بھی مروّج دیکھ رہا ہوں، تو مجھے کیسے پتہ لگیگا کہ یہ لفظ متروک ہوگیا؟ اور متروک ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ سترہ پندرہ بیس بیس برس میں الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ یہ بولنے والوں کا حق ہے، کوئی کیا کریگا! میری طالب علمی کے زمانے تک "شوہر" کے معنی میں "مرد" عورتوں کی زبان پر رواں تھا؛ اب بالکل سنائی نہیں دیتا۔ میں چاہوں تو اس کے معنی کے لیے ۱۹۵۵ کی سند تو درج کردوں، قاری کو غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ "مرد" بمعنی "شوہر" اب بھی رائج ہے۔

الفاظ کے معنی یا جنس بعض اوقات بہت جلد بدلنے یا متروک ہونے کی مثال خود ہی ارباب "لغت" نے انتہائی معصوم لاعلمی سے فراہم کردی ہے۔ انھوں نے "التفات" کو مذکر درج کیا ہے، اور بالکل ٹھیک درج کیا ہے؛ آج کل یہ بالاتفاق مذکر ہے۔ لیکن صاحبان "لغت" نے اسے مؤنث بھی درج کیا ہے، اور قدیم ترین شعری مثال (۱۷۵۵) مذکر کی ہے، اور جدید شعری مثال (۱۹۱۱ء) مونث ظاہر کرتی ہے۔ علم بدیع کی ضمن میں "بحر الفصاحت" کا اقتباس نقل کرکے (۱۹۲۶ء) لکھا ہے۔ اب سوچیے "التفات" علم بدیع کی کوئی اصطلاح ہے کہ نہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں اور اگر ۱۹۲۶ء میں نجم الغنی نے مذکر لکھا ہے، تو اسی کو مرجح ماننے۔ ویسے نجم الغنی نے خود یہ لکھا ہے کہ بحر الفصاحت پہلی بار ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی) جلیل مانک پوری نے اپنی کتاب "تذکرو تانیث" (۱۳۳۵ھ - ۱۹۱۶ء) میں لکھا ہے کہ اتفاق مذکر رہی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ ۱۹۱۱ء تک شاید اسے کسی نے مونث باندھا ہو، لیکن ۱۹۱۶ء کے آتے آتے اتفاق رائے مذکر پر ہوگیا۔ آفاق بنارسی کی معین الشعرا" (مرتبہ غالباً ۱۹۳۴، کتاب مصنف کی وفات (۱۹۳۵) کے بعد شائع ہوئی) میں دو شعر مذکر کے اور ایک مونث کا لکھا ہے۔ لیکن تینوں شعر قدیم ہیں۔ "لغت" میں تفصیلات کا اندراج نہیں ہے صرف قدیم شعرا "التفات" کو مذکر اور جدید شعرا (اگر ۱۹۱۱ء کو جدید مانا جائے) اسے مونث ظاہر کرتا ہے۔ اب صرف تاریخوں کے قدیم اور جدید ہونے سے کیسے پتا چلے کہ کون سا

لفظ متروک ، یا کون سی جنس متروک ہوگئی ؟ "صاحبانِ لغت" یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے کسی لفظ کے معنی، استعمال یا جنس کو متروک لکھ دیا، تو زبان محدود ہوجائیگی۔ انھوں نے اتنا بھی غور نہیں کیا کہ اگر کوئی لفظ استعمال نہیں ہوتا، تو زبان اس حد تک تو محدود ہو ہی گئی ؛ ان کے ظاہر کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ اور اگر ایک لفظ متروک ہوتا ہے، تو چار نئے داخل بھی ہوتے ہیں ؛ ورنہ زبان میں وسعت کس طرح آئے ؟ آپ ایک متروک لفظ کو دوبارہ استعمال یا مستعمل کرنا چاہتے ہیں، یہ بڑی اچھی بات ہے ۔ لیکن لغت نگار کا کام یہ ہے کہ زبان کی تاریخی (یعنی گزشتہ اور موجودہ) صورتِ حال کو ٹھیک ٹھیک بیان کرے ۔ لغت نگار علمائے ادب کے زمرے میں نہیں، بلکہ علمائے زبان کے زمرے میں ہیں ۔ جب علمائے ادب کسی متروک لفظ کو دوبارہ چالو کر دینگے تو علمائے زبان کو ماننا ہی پڑیگا ۔ لیکن علمائے زبان کو علمائے ادب کا بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں، نہ یہ ان کا منصب ہے ۔ بالکل اسی طرح جس طرح لفظ اختراع کرنا بھی لغت نگار کا منصب نہیں ۔ وہ محض عالمِ زبان ہوتا ہے، لغت کا اختراع کرنا عالمِ ادب کا منصب ہے ۔ اس نکتہ سے اربابِ "لغت" اچھی طرح آگاہ ہیں اور اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں ۔

الفاظ کو لغت کا درجہ دینے کے لیے اربابِ "لغت" نے جو اصول متعین کیے ہیں، ان کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں ۔ وہ کہتے ہیں غیر زبانوں کے ایسے الفاظ بھی درج کر لیے گئے ہیں، جو کم سے کم دو مصنفوں نے اپنی تصانیف میں استعمال کیے ہوں ۔ یہاں مصنف اور تصانیف کی تعریف متعین کرنا ضروری تھا ۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو شاید ایک ہی بار استعمال ہوئے ہوں ۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو شاید کبھی تحریر میں نہ آئے ہوں، لیکن پھر بھی انھیں لغت کا درجہ دیا جا سکتا ہے ۔ پھر مصنف کس مرتبہ کا ہو، کتاب یا تصنیف کا رتبہ کیا ہو، یہ باتیں بھی دھیان میں رکھنے کی ہیں ۔ مشکل یہ ہے کہ خود اربابِ "لغت" نے دو مصنفین کی شرط کا لحاظ نہیں کیا ہے (جیسا "اسبون"، "اسپوک" کی مثال سے واضح ہوا ہوگا) لیکن اس سے زیادہ گمراہ کن ان کا یہ نظریہ ہے : وہ لگی بندھی ترکیبیں جن سے مفردات کے معنی میں اضافہ ہوتا ہے ، یا جن کے اجزائے ترکیب کا مفہوم علیٰحدہ علیٰحدہ مبہم یا ناقص ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے "اب"

کے تحت "اب کے" "اب تب" "اب نہ تب" "اب آؤ تو جاؤ کہاں" بھی لغت بنائے جانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہاں مشکل در مشکل یہ ہے کہ اصول کچھ بیان کیا ہے اور مثالوں سے واضح کچھ ہوتا ہے۔ مثلاً "آہِ سحر" "بتِ ہزار شیوہ" "لگی بندھی ترکیبیں ہیں۔ ان سے مفردات کے معنی میں اضافہ بھی ہوتا ہے، کیوں کہ محض "آہ" اور "آہِ سحر" میں فرق ہے۔ اور "بت" کے مقابلے میں "بتِ ہزار شیوہ" مختلف معنی رکھتا ہے۔ لیکن لغت میں "آہِ سحر" تو درج ہے اور "بتِ ہزار شیوہ" ندارد۔ اگر کہا جائے کہ "بتِ ہزار شیوہ" لگی بندھی ترکیب نہیں ہے یا اس سے "بت" کے معنی میں اضافہ یا اختلاف نہیں واقع ہوتا، تو "بتِ بے پیر" کے بارے میں کیا خیال ہے؟ "بتِ بے پیر" بھی لغت میں درج نہیں ہے۔ "بے پیر" ضرور درج ہے۔ لیکن "بے پیر" کے بارے میں شک ہے کہ یہ فارسی میں بھی ہے کہ نہیں۔ "برہانِ قاطع" اور "بہارِ عجم" دونوں میں نہ "بتِ بے پیر" ملتا ہے، نہ "بے پیر"۔ "نور" نے لکھا ہے کہ فارسی میں "بے پیر" گالی کے طور پر مستعمل ہے (لیکن جو شعر نقل کیا ہے اس میں گالی کا کوئی مفہوم واضح نہیں۔ "بے پیر مرو تو در خرابات / ہر چند سکندرِ زمانی) اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعض شعرائے لکھنؤ "بے پیر" کو فارسی اضافت کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ "آصفیہ" میں ہے کہ کشمیری اس لفظ کو سخت گالی سمجھتے ہیں، اور جلال الدین اسیر کے سوا اور شعرائے فارسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا۔ "آصفیہ" نے جلال اسیر کا شعر نقل نہیں کیا ہے لیکن غالب نے بھی اپنے ایک خط میں جلال اسیر کے کسی شعر کا ذکر کیا ہے۔ اور سخت تعجب کیا ہے کہ ایرانی رئیس زادہ ایسا لفظ لکھے، جو بقول ان کے تورانی بچگانِ ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ لہٰذا طالب علم "بے پیر" سے "بتِ بے پیر" کی قیاسی ترکیب کا تصور نہیں کر سکتا ـــــ یہ ترکیب لغت میں درج نہ ہو تو طالب علم یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ اردو میں ہے ہی نہیں۔ حال آں کہ ظاہر ہے کہ اردو والوں نے اس کو متعدد بار استعمال کیا ہے۔ "بتِ بے پیر" کا لغت نہ قائم کر کے ارباب "لغت" نے بڑی زیادتی کی ہے۔

سب سے زیادہ مشکل انھوں نے یہ کر ڈال دی ہے کہ وہ تراکیب جن کے اجزائے ترکیبی کا مفہوم علیحدہ علیحدہ ناقص یا مبہم ہے، وہ بھی لغت کا استحقاق رکھتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی فقرے کے اجزائے ترکیب کا مفہوم الگ الگ لیا جائے گا تو وہ ناقص یا مبہم ٹھہرے گا۔ مثلاً "میں لکھنؤ گیا" ایک فقرہ ہے جس کے تینوں الفاظ اگر الگ الگ لیے جائیں، تو وہ مفہوم متعین نہیں ہو سکتا جو پورے فقرے کا ہے۔ لیکن اس پورے فقرے کا مکمل مفہوم بھی اپنے سیاق و سباق کا محتاج ہے۔ ایسے فقرے جس کا مکمل مفہوم سیاق و سباق کا محتاج ہو، لغت بننے کے لائق نہیں ہو سکتے۔ اور جو فقرے سیاق و سباق سے بے نیاز ہوتے ہیں، وہ روزمرّہ (Phrase) کے ذیل میں آتے ہیں انھیں لغت میں ضرور درج ہونا چاہیے۔ اربابِ "لغت" نے جو مثالیں درج کی ہیں، ان میں سے ایک جو پہلی ہے (اب جب) اس پر بحث کر چکا ہوں۔ بقیہ میں "اب کے" "اب تب (لگنا کرنا یا ہونا) محاورے ہیں اور "اب نہ تب" "آب آؤ تو جاؤ کہاں" روزمرّہ ہیں۔ ان کا اندراج مناسب بلکہ ضروری تھا۔ لیکن "اب بتا" "اب بول" یا "بولو" اور "اب بھی" (تاکیدی) کا اندراج فضول ہے کیونکہ ان کے معنی سیاق و سباق کے محتاج ہیں۔ یہ روزمرّہ کے ضمن میں نہیں آتے۔ "آصفیہ" نے بھی اس ضمن میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور "اب تک"، "اب بھی" درج کیے ہیں۔ لیکن کثیر پیمانے پر یہ بدعت "نور" نے شروع کی۔ اس میں "اب بتاؤ"، "اب بھی" "اب پھنسے"، (اس پر میں گزشتہ صفحات میں بحث کر چکا ہوں) "اب تک" "اب تلک" "اب جاکے" (اس پر بحث کر چکا ہوں)، "اب کہیے" وغیرہ کی بھرمار ہے۔ دراصل صاحبانِ "آصفیہ" و "نور" اور "لغت" کے ذہن فقرہ، روزمرّہ، محاورہ اور ضرب المثل کے بارے میں صاف نہیں ہیں — انھوں نے ان اصطلاحات کے معنی اور تعریف متعین کرنے کی زحمت ہی نہیں گوارا کی۔ "آصفیہ" اور "نور" تو آکسفرڈ ڈکشنری سے بے خبر تھے، لیکن "اربابِ لغت" کو تو دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنا لغت اسی کے نمونے پر مرتب کیا ہے۔ لہٰذا ان سے یہ توقع بجا ہے کہ انھوں نے اس معاملے پر بھی غور کیا ہوگا۔ لیکن انھوں نے صرف یہ کیا ہے کہ "آصفیہ" اور "نور" کی مکھیوں پر درجنوں مکھیاں اور مار دی ہیں۔

اردو کی حد تک فقرہ، روزمرّہ، محاورہ اور ضرب المثل کی تعریف یوں متعین ہو سکتی ہے:

(۱) فقرہ Construction یا Structure وہ عبارت ہے (الفاظ کا وہ مجموعہ ہے) جس کی شکل (یعنی ترتیب (ترمیم ناپذیر (یا متعین) ہو یا نہ ہو، لیکن جو اپنے معنی کے لیے سیاق و سباق کا کسی حد تک محتاج ہو، اور جس کے اجزائے ترکیبی اپنے لغوی، عام فہم معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ "میں لکھنؤ گیا"، یا "بندر کا بچہ" فقرے ہیں، جن میں تمام الفاظ اپنے لغوی عام فہم معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی صحیح قیمت (یعنی مفصل معنی) ان کے سیاق و سباق پر منحصر ہیں۔ یہی حال "اب بتاؤ"، "اب بول"، "ادھر دیکھ"، "بڑی مشکل ہے"، "کچھ بات کہنی ہے"، وغیرہ عبارتوں کی ہے۔ ان سب میں جتنے الفاظ ہیں وہ اپنے عام فہم لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور ان عبارتوں کی صحیح قیمت ان کے سیاق و سباق کے بغیر متعین نہیں ہو سکتی۔

(۲) روزمرہ Phrase وہ عبارت ہے (الفاظ کا وہ مجموعہ ہے) جس کی شکل (یعنی ترتیب) اکثر ترمیم ناپذیر (یا متعین) ہوتی ہے اور جس کے مفصل معنی خود اسی کے اندر ہوتے ہیں، خواہ وہ معنی ظاہر (Explicit) ہوں یا مضمر (Implicit) ہوں۔ اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معنی اکثر لغوی عام فہم معنی سے زیادہ (یا مختلف) ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ سیاق و سباق کے محتاج نہیں ہوتے۔ مثلاً "اب / پھر کیا پوچھنا ہے / تھا"، یا "اب کے بچی تو گھر گھر نچی"، "آصفیہ" ان دونوں سے خالی ہے۔ "نور" میں اول الذکر نہیں ہے، آخر الذکر ہے لیکن صیغہ مونث کی جگہ مذکر کا ہے۔ "الغت" نے اس باب میں "نور" کا اتباع کیا ہے۔ "لغت" میں اوّل الذکر بھی ہے، لیکن "پھر" اور "تھا" کے بغیر۔) مزید مثالیں ملاحظہ ہوں: "بے بات کی بات"، "اس کی / میری / اپنی / اُن کی / ہماری / تمھاری / بلا سے / جانے"، "اس سے اچھے ان سے / خدا سمجھے"، "کچھ کا کچھ سمجھنا / سمجھ لینا / سمجھا"، "آؤ جاؤ گھر تمھارا ہے"، "اسے اپنا ہی گھر سمجھیے"، "ہائے توبہ"، "جلنے میری / اس کی بلا" وغیرہ۔ انگریزی میں اس زبان کو Idiomatic کہتے ہیں جو روزمرہ کے مطابق ہو چاہے اس میں اصطلاحی معنوں والے محاوروں کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔

(۳) محاورہ۔ Idiom) وہ عبارت ہے (الفاظ کا وہ مجموعہ ہے) جس کی شکل

(یعنی ترتیب) ہمیشہ ترمیم ناپذیر اور متعیّن ہے اور جس کے مفصّل معنی خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر وہ معنی ظاہر نہیں بلکہ Implicit ہوتے ہیں، کیونکہ محاورے میں استعمال ہونے والے الفاظ زیادہ تر استعاراتی رنگ لیے ہوتے ہیں (بلکہ اکثر محاورے استعارہ ہی ہوتے ہیں) محاورے کے معنی بھی سیاق وسباق کے محتاج نہیں ہوتے۔ محاورے عام طور پر مصدری (Infinitive) شکل میں ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں۔ محاورے کی ضروری شرطیں ہیں (۱) الفاظ کا ترمیم ناپذیر ہونا اور (۲) استعاراتی ہونا۔ محاورے کی مثالیں دینا غیر ضروری ہے، لیکن ایک آدھ بات کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ "آب" بمعنی "چمک" یا "کاٹ" محاورہ نہیں ہے لیکن "آب تیغ کھانا" یا "آب تیغ پینا" محاورہ ہے۔ لہذا یہ تو ممکن ہے کہ "چمک" یا "کاٹ" کے معنی میں "آب" کی جگہ "چمک" یا "کاٹ" لکھ دیا جائے، لیکن تلوار کا زخم کھانے کے معنی میں "تلوار کا پانی پینا" نہیں لکھ سکتے۔ لہذا محاورے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اکثر محاوروں کا لفظی ترجمہ اصل محاورے کی جگہ نہیں استعمال ہو سکتا۔

(۴) ضرب المثل کے لیے انگریزی میں کئی لفظ ہیں، Saying, Saw, Epigram, Apopthegm, Proverb, Maxim، وغیرہ)۔ Epigram عام طور پر ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے، لیکن کسی چبھتے ہوئے موثر فقرے کو بھی Epigram کہتے ہیں، ملاحظہ ہو O. E. D.) ضرب المثل کے لیے عام طور پر شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ موزوں اور مقفیٰ ہوتی ہے اور اس کے پس پشت کوئی اصلی یا فرضی واقعہ ہوتا ہے، یا اس کی بنیاد کسی تجربے یا مشاہدے یا تصوّر (CONCEPT) پر ہوتی ہے اور اس کے الفاظ اتنے تفصیلی ہوتے ہیں کہ خود انھیں سے کسی واقعے یا وقوعہ (گزشتہ یا آیندہ) کسی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ضرب المثل میں استعارے کا رنگ فطری ہے، لیکن ہر ضرب المثل میں استعاراتی کیفیت برابر کے درجے کی نہیں ہوتی۔ بعض میں بہت کم ہوتی ہے، بعض میں بہت زیادہ۔ ضرب المثل کے بھی الفاظ کی شکل (یعنی ترتیب) ترمیم ناپذیر اور متعیّن ہوتی ہے۔ ضرب المثل کی مثالیں دینا غیر ضروری ہے۔ اگر اول الذکر تین تراکیب کی تعریف واضح ہوگئی ہے تو ضرب المثل کی تعریف خود بخود صاف

ہو گئی ہو گی۔

اب یہ دیکھنے کے لیے کہ لغت نگار زبان کے ان چار مظاہر کے ساتھ کیا رویّہ رکھتا ہے، میں بالکل آنکھ بند کر کے آکسفرڈ ڈکشنری کھولتا ہوں۔ آنکھ کھولتا ہوں تو لفظ BLOCK سامنے پڑتا ہے جسن اتفاق سے یہ لفظ ہر طرح سے مناسب ہے کیونکہ یہ لفظ خاصا قدیم بھی ہے، اور اس کے ساتھ محاورے وغیرہ بھی وابستہ ہیں BLOCK کے پہلے معنی لکڑی کا ایک ٹھوس ٹکڑا بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس لفظ کو اکثر بجیسی، بے عقلی، کم عقلی کی تشبیہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر مثالیں لکھی ہیں۔ پھر ایک متروک معنی درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بعض متروک کہاوتی روزمرّوں یعنی PHRASES میں اسے بھوسے (STRAW) کے متضاد کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ پھر مثالیں درج کی ہیں۔ پھر ایک اور معنی درج کر کے اس سے متعلق ایک محاورہ لکھا ہے: BEETLE AND THE BLOCK اور کہا ہے کہ اسے BEETLE کے ذیل میں دیکھیے۔ پھر ایک معنی لکھے ہیں، کوئی ٹھنٹھ نما چیز جس کی مدد سے گھوڑے پر چڑھا یا اترا جائے اور لکھا ہے کہ اس مفہوم میں استعاراتی استعمال بھی ہوا ہے (یعنی BLOCK اور HORSE کو یکجا کر کے استعارہ بھی بنایا گیا ہے) پھر اور معنی لکھ کر یہ لکھا ہے کہ ہیٹ کے قالب (MOULD) کو بھی کہتے ہیں، اس لیے استعارتاً "ہیٹ" کے فیشن یا طرز کو بھی (BLOCK) کہا جاتا ہے۔ پھر حجاموں کی اصطلاح کے طور پر Barber's BLOCK کے معنی "مصنوعی بالوں والی ٹوپی" لکھے ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ اس سے تبادلہ ہو کر SLANG میں Block کے معنی "سر" ہو گئے۔ کچھ معنی اور بیان کرنے کے بعد جہازرانوں کا روزمرّہ (PHRASE) دیا ہے BLACK & BLOCK اور اس کی مثال دی ہے۔ پھر بہت سی حرفتوں کے اصطلاحی معنی دیے ہیں۔ پھر ایک معنی اور دے کر لکھا ہے کہ اس سے روزمرّہ بنتا ہے IN BLOCK) یعنی "سب کے سب" "بحیثیت مجموعی"۔ اس کے بعد ایک اور معنی دے کر لکھا ہے کہ اب یہ معنی محض ایک محاورے (STUMBLING BLOCK)) میں باقی رہ گئے ہیں۔ پھر ایک معنی دے کر ایک روزمرّہ (ERRATIC BLOCK) لکھا ہے۔ کچھ معنی اور دینے کے بعد BLOCK کے مجازی

معنی بیان کیے ہیں۔ پھر ان سے متعلق روزمرّہ درج کیے ہیں، مثلاً A CHIP OF THE OLD BLOCK ۔پھر اس کے بعد مزید اصطلاحی معنی لکھے ہیں۔ سب سے آخر میں بعض الفاظ لکھے ہیں جو BLOCK کے ساتھ کسی اور لفظ کو ملا کر بنتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ O.E.D. کا طریق کار اربابِ لغت" سے ذرا مختلف ہے۔ لیکن اس سے اربابِ لغت" پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ O.E.D. نے محاوروں، استعاراتی استعمال، روزمرّے، کہاوتوں کا اندراج تو کیا ہے، لیکن اِدھر اُدھر کے فقرے، جن کے معنی سیاق و سباق کے بغیر نامکمل رہتے ہیں، نظرانداز کر دیے ہیں، چنانچہ O.E.D. میں اس قسم کے فقرے مثلاً BLOCK OF GOLD یا ROAD-BLOCK وغیرہ (یا جن کے معنی BLOCK سے واضح ہو سکتے ہیں اور جن میں کوئی خصوصیت روزمرّہ یا محاورہ یا کہاوت کی نہیں ہے) درج نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف، اربابِ "نور" و "لغت" اور علی الخصوص اربابِ "لغت" نے اندھا دھند ایسے فقرے درج کیے ہیں جو ہرگز لغت نہ بنتے بشرطے کہ ان کے ذہنوں میں "لفظ" "روزمرّہ" "محاورہ" اور "ضرب المثل" کی تعریف واضح ہوتی۔ چند مثالیں بالکل سرسری ورق گردانی کے بعد مزید نقل کرتا ہوں:

"نور" آنکھیں رو رو کے سجانا، آنکھیں روتے روتے سوج جانا، آنکھیں رو رو کے لال کرنا، آنکھیں قدموں پر ملنا (اس کو قدم بمعنی پانوں" کی تقطیع میں جگہ مل سکتی تھی) آوازِ پا (آواز کے معنی پانوں کی آہٹ، پہلے ہی لکھ چکے ہیں) آواز سنانا آوازِ صور (اسے "صور" کی تقطیع میں شاید جگہ مل سکتی تھی) آوازِ غیب (اسے شاید "غیب" کی تقطیع میں جگہ مل سکتی تھی) آوازِ قدم، آواز کان تک پہنچانا، آواز گرجنا، آوازِ گریہ، آواز میں رعشہ ہونا۔ آواز نکلنا کے معنی "صدا، ہانک، پکار" پہلے ہی لکھ چکے ہیں)۔

"لغت": آنکھوں پر غفلت کا پردہ / پردے پڑنا (آنکھوں پر پردہ۔ پردے پڑنا پہلے درج کر چکے ہیں) آنکھ کا اندھا، آنکھوں کی اندھی، آنکھ کا / کی کیچڑ (اس کی جگہ "کیچڑ" کی تقطیع میں ہونا چاہیے تھی،) آنکھ کی سیل، آنکھوں کی سیل (ان کی جگہ "سیل"

کی تقطیع میں تھی) آنکھ کی گردش۔ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنا/چلنا/گرنا۔ آوازِ بازگشت (اس کی جگہ "بازگشت" کی تقطیع میں تھی) آوازِ پا "آوازِ پر لبیک کہنا، آوازِ پیدا ہونا، آوازِ خندہ، آوازِ درا، آوازِ غیب، آواز گونجنا، (اس کی سند میں امیر اللغات کا جملہ دیا ہے' جس سے مکان کا گونج اٹھنا ظاہر ہوتا ہے: "کیا آواز ہے کہ سارا مکان گونج اٹھا"' اگر اس طرح مصادر لگا کر اندراجات کرنا ہیں تو "آواز پھیلنا" کیوں چھوڑ دیا؟ "آواز آنا" "آواز جانا" تک تو لکھ دیا ہے

حاصل کلام یہ کہ اسناد و مصادر کے معمولہ میل (COMBINATION) اور ہر طرح کے معمولہ معانی والے فقرے درج کرنے سے لغت کا حجم تو بڑھ سکتا ہے، لیکن زبان کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ اگر اسناد و مصادر کے میل اور اسناد کی صفات دکھانا ہی منظور تھا، تو "بہارِ عجم" کی طرح ایک ہی تقطیع میں سب کو درج کر دیتے کہ اس اسم کے ساتھ فلاں فلاں مصادر مستعمل ہیں۔ یا پھر اس فہرست کو اس حد تک مکمل بناتے کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مثلاً "آواز پھیلنا" آواز ابھرنا" "آواز پکڑنا" "آواز پڑنا" "آواز اچھلنا" وغیرہ لکھ کر صاحبان "نور" و "لغت" نے زبان اور طالب علم کے ساتھ دو زیادتیاں کی ہیں۔ طالب علم یا تو سمجھیگا کہ "لغت" اور "نور" میں مندرج فہرستیں مکمل ہیں، اس لیے "آواز پھیلنا" وغیرہ اردو میں نہیں ہیں۔ یا پھر وہ یہ سمجھیگا کہ چوں کہ ان میں "آواز پھیلنا" وغیرہ نہیں ہیں، اس لیے فہرستیں نامکمل ہیں اور "آواز بولنا" "آواز پکارنا" "آواز بہانا" وغیرہ بھی ممکن ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ یا تو یہ فہرست بالکل ہی مکمل ہوتی (ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے) یا صرف اصلی محاورے اور روزمرے درج کر دیے جاتے تاکہ قیاس کی گنجائش رہ جاتی، لیکن غلط فہمی کا امکان رفع ہو جاتا۔ موجودہ صورت میں الفاظ کے جو دریا ان لغات میں بہائے گئے ہیں، ان میں علم اور طالب علم دونوں کا سفینہ غرق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لغت اور غیر لغت میں فرق نہ کرنے کی بڑی وجہ اربابِ "لغت" اور صاحبِ "نور" کی لاعلمی نہیں، بلکہ اس مناسبت اور موانست کی کمی ہے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ لغت نگار اہلِ زبان ہو یا نہ ہو، اس کو اگر زبان کے ساتھ مناسبت نہیں ہے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ امیر مینائی سے بڑھ کر اہلِ زبان کون ہوگا، اور

نظیر اکبرآبادی سے بڑھ کر کم ہی شاعروں نے نئے نئے لفظ استعمال کیے ہونگے۔ اس کے باوجود امیر مینائی نے "امیر اللغات" مرتب کرنے کے دوران ایک خط میں لکھا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے کلام نے انھیں ایک لفظ کا بھی فائدہ نہیں دیا۔ ایسے اہلِ زبان میں لغت نویسی کی لیاقت معلوم! لغت اور غیر لغت میں فرق کرنے سے متعلق مسئلہ یہ بھی ہے کہ لغت کو کہاں درج کیا جائے۔ اس سلسلے میں "نور" اور "لغت" کے بعض مسامحات کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ ایک اور مثال سے اپنی بات مزید واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس میں بعض اور نکات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مصدر "چلنا" کے ایک مجازی معنی ہیں، "شروع ہونا"۔ اب اس کے ساتھ بعض دوسرے مصادر کی تصریفی شکل لگا کر اس مصدر میں بیان کردہ عمل کے شروع ہونے کا مصدر بنتا ہے۔ مثلاً "ہو چلنا" (شام ہو چلی تھی)، "بھر چلنا" (زخم بھر چلے ہیں)، "ابھر چلنا" (چوٹ کے نشان ابھر چلے ہیں) وغیرہ۔ "نور" اور اربابِ لغت نے "چلنا" کے اس معنی پر غور نہیں کیا، اور "ابھر چلنا" کا علیحدہ لغت قائم کرکے معنی لکھے ہیں۔ "نمو شروع ہونا"، "ترقی کرنے لگنا" ("نور") اور (۳) ترقی کرنے لگنا، حالت سنبھلنا۔ ("لغت") اس پر "نور" کا حوالہ دیا، لیکن دو اور محاوراتی معنی نقل کرنے کے باوجود (جن کا ماخذ "مہذب اللغات" ہے) اربابِ "لغت" نے معلوم نہیں کیوں، "نور" کے پہلے معنی (نمو شروع ہونا) نہیں درج کیے۔ یہ بات الگ رہی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ "ابھر چلنا" کے ان مفاہیم میں جو "نور" اور "لغت" سے میں نے نقل کیے ہیں، اصل مفہوم "چلنا" سے برآمد ہوتا ہے "ابھر" سے نہیں۔ میر کا شعر ہے:

نشانِ اشکِ خونیں کے اڑتے چلے ہیں
خزاں ہو چلی ہے بہارِ گریباں

فورٹ ولیم ۱۸۱۱ (کلیات، دیوانِ دل)[۱۳۴]

دونوں مصرعوں میں "چلنا" کا مفہوم متحد ہے (شروع ہونا) اس کو نظر انداز کرنے کے باعث "نور" اور "لغت" نے ایک غیر ضروری اندراج کر دیا ہے۔ اور تاثر یہ پیدا کیا ہے کہ "اڑ چلنا"، "ہو چلنا"، "بھر چلنا" وغیرہ زبان میں داخل نہیں ہیں۔ "لغت" کا تو پتہ نہیں، کیونکہ تقطیع "بھر" ان کے یہاں جلد سوم میں ہوگی، لیکن "نور" نے "بھر چلنا" درج نہیں کیا ہے۔ "آصفیہ" نے احسن بات کی ہے کہ "چلنا" کا مفہوم "شروع ہونا"

بھی درج کیا ہے اور "ابھر چلنا" وغیرہ قسم کے گمراہ کن اندراج نہیں کیے۔ "اڑ چلنا" کے تحت "نور" اور "لغت" نے گل پر گل کھلائے ہیں۔ اوّل تو دونوں نے "اڑنا شروع ہونا" والے معنی نظر انداز کر دیے ہیں۔ دوم یہ کہ "نور" نے تین معنی لکھے ہیں، جن میں دو اگر بالکل نہیں تو تقریباً ایک سے ہیں۔ ایک دو معنی "آصفیہ" نے زائد بیان کیے ہیں اور "ارباب لغت" نے یہ غضب کیا ہے کہ "آصفیہ" "نور" اور "پلیٹس" کے حوالے سے مندرجۂ ذیل معنی لکھے ہیں: (میں پوری عبارت نقل کرتا ہوں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ رہے)۔

اڑ چلنا (محاورہ) بدچلن ہونا، بدکرداری اختیار کرنا، آوارہ ہونا، اترانا
(فرہنگ آصفیہ ۱: ۱۵۳؛ نور اللغات ۱: ۳۱۵؛ پلیٹس)

اس بات سے قطع نظر کہ "آصفیہ" اور "نور" کے صفحہ نمبر غلط ہیں (ممکن ہے میرا ایڈیشن مختلف ہو) اور پلیٹس کا صفحہ نمبر نہیں دیا، "بدچلن ہونا" "بدکرداری اختیار کرنا" اور "آوارہ ہونا" نہ "آصفیہ" میں ہے نہ "نور" میں نہ پلیٹس میں۔ میرے ایڈیشن کے صفحہ ۱۵۲ پر "آصفیہ" میں "بدراہ بننا" "بدچلنی اختیار کرنا" ضرور درج ہے اور میرے "نور" کے ایڈیشن کے صفحہ ۲۷۲ پر "آوارہ ہو جانا" بھی درج ہے۔ پلیٹس (میرے ایڈیشن میں صفحہ ۴۸) کے یہاں بدچلن، آوارہ وغیرہ قسم کے معنی نہیں ہیں، ہاں "اترانا" اور "کسی چیز میں بےحد مغرور ہو جانا" ضرور ملتا ہے۔ "ارباب لغت" اس بات کو کس طرح ثابت کریں گے کہ "آصفیہ" اور "نور" کے حوالے سے جو معنی انھوں نے درج کیے ہیں، وہ وہی ہیں جو "آصفیہ" اور "نور" نے لکھے ہیں؟ الفاظ کا ذرا سا ہیر پھیر کر کے "ارباب لغت" نے معنی کچھ سے کچھ کر دیے۔ خود بھی گناہ کے مرتکب ہوئے، اور بیچاری "آصفیہ" اور "نور" کو بھی بدنام کیا۔ وہ صاحبان جو "بدچلن ہونا" اور "بدچلنی اختیار کرنا" اور "آوارہ ہو جانا" کو ایک سمجھتے ہوں، جو "بدراہ بننا" کا ترجمہ "بدکرداری اختیار کرنا" سمجھتے ہوں، انھیں اردو کی پرائمری جماعت میں محمد حسین آزاد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتاب دوبارہ شروع کرنا چاہیے۔ (اور علمی بددیانتی کی سزا کے طور پر "چلنا" کے معنی "شروع ہونا" بھی ایک ہزار بار یاد کرنا چاہیے)۔

میں نے شروع میں لکھا تھا کہ لغت نگار کے سامنے بامعنی اور بےمعنی الفاظ کا بھی

مسئلہ ہوتا ہے یعنی کونسے بچگانی الفاظ درج کیے جائیں اور کونسے ترک کیے جائیں بچگانی الفاظ کئی طرح کے ہوسکتے ہیں :

۱۔ گھڑے ہوئے الفاظ، خواہ وہ محض تفریحاً بنا لیے گئے ہوں (جیسے منٹو کا فل فل فوٹی، لڑکی کے معنی میں)، خواہ اصطلاحاً وضع کیے گئے ہوں، (جیسے Colour blind کے لیے مولوی عبدالحق مرحوم کا "رنگو ندھا")۔ ایسے الفاظ اگر مروج نہیں ہوئے (خواہ انھیں کسی مصنفوں نے استعمال کیا ہو) تو وہ لغت نہیں بن سکتے۔

۲۔ وہ الفاظ جو مروج تو ہیں، لیکن جن کی اصل نہیں معلوم، یا جن کی کوئی اصل نہیں، لہٰذا ان کے معنی سراسر سماعی ہیں۔ مثلاً "چھیچھا لیدر" "کتا خصّی" "اشتم پشتم" اس طرح کے سب الفاظ لغت بنائے جائینگے۔

۳۔ وہ الفاظ جو فجائیہ مفہوم یا کیفیت رکھتے ہوں مثلاً "ہاں" "ہیں" اور "ہی" (ہائیں کے معنی میں)، "خود" "ہائیں" (بھی اسی قسم کا فجائیہ ہے) "اوہو" "اہاہا" "اخاہ" وغیرہ، یہ سب لغت بنائے جائینگے۔

۴۔ بچوں کے الفاظ۔ یہ کئی طرح کے ہوسکتے ہیں :

(الف) وہ آوازیں جو بچے اس وقت نکالتے ہیں، جب انھیں بولنا نہیں آتا مثلاً "آغوں" "اکہ" انھیں لغت بنانا چاہیے۔

(ب) وہ الفاظ جو بچے توتلے پن کی وجہ سے صحیح تلفظ سے مختلف ادا کرتے ہیں، یا انھیں مختصر کرکے ادا کرتے ہیں، مثلاً "چھپکلی" کی جگہ "پھکی" "بندر" کی جگہ "بن بن" "شیر" کی جگہ "چھیل" "کتا" کی جگہ "تتا" (میں نے ایک بچے کو گائے کی جگہ "جائے" کہتے سنا) ایسے الفاظ لغت نہیں بن سکتے، کیونکہ یہ مستقل نہیں ہیں، مختلف بچے مختلف طرح بولتے ہیں۔

(ج) وہ الفاظ جو بچے یا بڑے آپس میں کھیل یا دل بہلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے آنکھوں پر انگلیاں رکھ کر یا کسی کے پیچھے سے جھانک کر "اجھاں" کہنا، کھانے کو "ہپّا" کہنا۔ چونکہ یہ الفاظ مستقل ہو چکے ہیں، اس لیے انھیں لغت میں آنا چاہیے۔

(د) وہ الفاظ جو صرف بچّوں کے مخصوص ہیں، جیسے پانی کو "مم" کہنا؛ رفع حاجت کرنے کو "اینہہ کرنا"، یا محض "اینہہ" یا "چھی کرنا" کہنا۔ یہ الفاظ بھی مستقل ہو چکے ہیں اور انھیں لغت میں آنا چاہیے۔

(ہ) وہ الفاظ جو بچے آپس میں کھیل کے وقت (یا کھیل کے نام بیان کرنے کے لیے) استعمال کرتے ہیں، مثلاً "اکڑ بکڑ بمبے بو، اسی نوّے پورے سو، سو میں لگا دھاگا چور نکل کر بھاگا" وغیرہ۔ اس طرح کے الفاظ اور فقرے لغت میں درج ہونا چاہییں۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ بعض ترقی یافتہ زبانوں (مثلاً جاپانی) میں بچّوں کی مستقل زبان ہوتی ہے جسے وہ بارہ برس کی عمر تک استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں مستقل زبان تو نہیں ہے، لیکن (جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے) بہت سے مستقل الفاظ اور فقرے ضرور ہیں، یہ زبان کا بہت اہم حصّہ ہیں۔ انھیں نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں "آصفیہ"، "نور" اور "لغت" تینوں ناکافی اور نامکمّل نظر آتی ہیں۔ "الف" اور "ب" کی تقطیع میں آنے والے شق نمبر دو مندرجہ بالا کے بعض الفاظ، جن سے یہ تینوں لغات خالی ہیں، حسب ذیل ہیں:

انڈ بنڈ۔ بڑبک۔ اکسٹھ باسٹھ

اسی تقطیع کے بعض فجائیہ الفاظ جو بعض میں ہیں، اور بعض میں نہیں، حسب ذیل ہیں:

اخّاہ، اخوہ

(آصفیہ میں نہیں۔) اخوہ (نور میں نہیں۔) بک یا بھک (دونوں غالباً بھاگ سے بنے ہیں) ("آصفیہ"، "نور"، "لغت" تینوں میں نہیں۔) آئیں (ا،ی، کی تشدید؛ "آصفیہ"، "نور"، "لغت"، تینوں میں نہیں۔)

بچّوں کی بولی والے الفاظ اور فقرے جو اس تقطیع میں آتے ہیں، تقریباً سب کے سب ان لغات سے غائب ہیں، حتیٰ کہ اکڑ بکڑ بمبے بو تک نہیں جس میں مجروح سلطان پوری فلمی گانا بھی لکھ چکے ہیں۔

معلوم ہوا کہ بعض الفاظ جو لغت بننے کے لائق ہیں، ہمارے تینوں اہم لغات کے

اربابِ حل وعقل نے اکثر نظر انداز کردیے ہیں ۔

میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ لغت نگار کو ایک ہی لغت پر بھروسا نہ کرنا چاہیے۔ اس اصول کو سب سے زیادہ نظر انداز کرنے والے "اربابِ لغت" ہیں۔ انھوں نے کئی الفاظ محض "جامع اللغات" یا ایسے ہی کسی ایک لغت کے حوالے سے درج کیے ہیں۔ بعض الفاظ میں تو انھوں نے ایسی ٹھوکر کھائی ہے کہ توبہ بھلی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسپینی مکھی : ایک قسم کی آبلہ انگیز مکھّی جسے خشک کرکے بطور دوا استعمال کرتے ہیں، ہسپانوی مکھی، اسپنیش فلائی ۔

اس کے بعد سرسید کا ایک جملہ نقل کیا ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ "اسپینی مکھی" ایک قسم کی آبلہ انگیز مکھی" ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اربابِ "لغت" نے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے انگریزی اردو لغت میں SPANISH FLY کا مطلب "ہسپانوی مکھی" دیکھا اور سند کی تلاش میں نکل پڑے۔ سند ملی تو معنی قیاس کر لیے۔ اگر وہ آکسفرڈ کی چھوٹی والی ڈکشنری بھی دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ SPANISH FLY ایک پودا ہوتا ہے جس کو قوتِ باہ کی دواؤں میں استعمال کرتے ہیں۔

اسپینیل : ایک ولایتی کتا جس کے کان اور بال لمبے ہوتے ہیں ۔

یہ معنی "جامع اللغات" کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں۔ خدا معلوم کیا قباحت ہو جاتی اگر کسی معمولی انگریزی ڈکشنری کو بھی ملاحظہ فرما لیتے۔ بہت سے کتوں کے کان اور بال لمبے ہوتے ہیں، اس میں "اسپینیل" کی کیا تخصیص ہے؟ اور ہر اسپینیل کے بال لمبے بھی نہیں ہوتے، صرف کاکر اور واٹر اسپینیل کے بال لمبے ہوتے ہیں۔ اور اسپینیل ولایتی نہیں، بلکہ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، ہسپانوی النسل کتا ہے۔ جتنی معلومات فراہم کیں، سب غلط یا گمراہ کن۔ تقریباً وہی حال گرد یا جو بیچاری ہسپانوی مکھی کا کیا تھا۔

بروکیڈ : جامہ وار، زربفت، کمخواب

تین قسم کے کپڑے، ایک بروکیڈ کے معنی میں، جو نہ اردو کا لفظ ہے، اور نہ ہی کپڑے کی کوئی مخصوص قسم ہے، بس اس لیے لکھ دیے کہ کوئی نہ کوئی توصیح بیٹھ جائیگا۔ یہ معنی

شاید کسی دیہاتی بزاز سے پوچھ کر لکھے ہیں، ورنہ کسی معمولی انگریزی ڈکشنری میں دیکھ لیتے تو معلوم ہو جاتا کہ بروکیڈ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر PATTERN ابھرا ہوا ہو، اور ہر اس ہندستانی کپڑے کو کہتے ہیں جس میں سونے چاندی کے تار لگے ہوں یعنی زربفت اور کمخواب۔ اردو لفظوں کا انگریزی ترجمہ کر کے اردو کے لغت میں شامل کرنا اور پھر معنی غلط لکھنا، ارباب لغت ہی کے بس کا روگ ہے۔ یہی حال رہا تو "لغت" کے اختتام تک انگریزی کے صدہا الفاظ اردو سے ترجمہ ہو کر دوبارہ اردو "لغت" کی زینت بن جائینگے۔ مجھے یقین ہے کہ اس منطق سے کام لیتے ہوئے صاحبان "لغت" نے "کوکونٹ"، "مانگو"، "روز" وغیرہ بھی شامل کر لیے ہونگے۔ ایسی حرکتیں "آصفیہ" اور "نور" نے بھی کی ہیں، مگر شاذ۔ اس کے علاوہ، ان لوگوں پر انگریزوں کی دھونس بھی تھی۔ وہ یہ دکھانا چاہتے تھے کہ انگریزی کے بیشمار الفاظ اردو میں دخیل ہو گئے ہیں ورنہ "بورڈ آف ریونیو"، "بل" بمعنی ہنڈی، "قبض الوصول" "بک"، بمعنی کتاب وغیرہ کا اردو کے لغت میں کیا محل؟ اسی دھونس میں آصفیہ نے "بگھی" اور "بالٹی" تک کو انگریزی کی سند دے دی۔ انگریزی BUGGY کے بارے میں O.E.D. کا خیال ہے اس کی اصل نامعلوم ہے، لیکن اسے ہند۔ انگریزی ماننے کی کوئی وجہ نہیں (پلیٹس "بگھی" کو ہندی کہتا ہے اور "بالٹی" کے بارے میں کہتا ہے کہ مراٹھی میں یہ "بلٹی" ہے۔) خیر، آصفیہ" اور "نور" پر انگریزی انگریزوں کی دھونس سمجھ میں آتی ہے، لیکن ارباب "لغت" کو انگریزی الفاظ کیوں اس قدر مرغوب ہیں! اور مرغوب ہیں تو ان کے صحیح معنی کیوں نہیں لکھتے؟ یہ ساری قباحتیں "لفظ" کی صحیح تعریف متعین نہ کرنے اور معنی و مرادف کی ضروری تحقیق سے گریز کرنے کی باعث پیدا ہوئی ہیں۔

اب الفاظ کو ترتیب سے جمع کرنے کے مسئلے پر آیئے۔ یہاں بھی "نور" "آصفیہ" اور "لغت" اپنی اپنی راہ پر گامزن ہیں۔ الفاظ کی ترتیب کے مندرجۂ ذیل طریقے ممکن ہیں۔ لغت نگار کو ضروری ہے کہ ان پر غور کر کے وہ طریقہ اپنائے جس میں لغت کے قاری کو سہولت ہو، اور جو زبان کے مزاج اور تاریخی پس منظر سے ہم آہنگ بھی ہو۔ بہر حال وہ طریقے یہ ہیں:

۱۔ الفاظ کو کسی ترتیب کے بغیر درج کر دیا جائے۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ اگر لغت میں دس ہزار الفاظ ہیں، تو کسی ایک لفظ کا فوراً مل جانا دس ہزار کے مقابلے میں ایک کا امکان رکھتا ہے۔ اور اگر لغت بہت ضخیم ہے، تو امکان بعید تر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ انتہائی غیر منظم اور طالب علم کے لیے تکلیف دہ ہے۔ (بعض قدیم فارسی لغات میں یہی کیا گیا ہے۔)

۲۔ الفاظ کو آخری حرف کے اعتبار سے جمع کیا جائے۔ مثلاً دل، مجل، عنادل سب یکجا کر دیے جائیں۔ اس طریقے میں ڈھونڈنے والے کی مشکل کم ہو جاتی ہے، لیکن اگر کسی تقطیع میں پانچ سو الفاظ ہیں تو مطلوبہ لفظ کا فوراً مل جانا پانچ سو کے مقابلے میں ایک کا امکان رکھیگا۔ اور محاوروں، روزمرّوں اور ضرب الامثال وغیرہ کے درج کرنے میں بہت مشکل ہوگی۔

۳۔ الفاظ کو آخری اور پہلے دونوں حروف کے اعتبار سے جمع کیا جائے۔ مثلاً الف مع لام کی تقطیع الگ ہو، اور الف مع واؤ الگ ہو، یہ طریقہ اچھا ہے، لیکن اس میں محاوروں، روزمرّوں وغیرہ کا اندراج آسانی سے نہیں ہو سکتا، کیوں کہ ایک ہی محاورے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں، اس طریقے کی رو سے انھیں الگ الگ درج کرنا ہوگا۔

۴۔ الفاظ کو آخری اور پہلے دونوں حروف کے اعتبار سے جمع کیا جائے اور پھر اس کے اندر ترتیب یہ ہو کہ پہلے حرف کے بعد والے حرف کا لحاظ بھی رکھا جائے۔ مثلاً الف مع لام میں "امل" پہلے آئے اور "اوّل" بعد میں، (کیونکہ "امل" میں الف کے بعد میم ہے جو واؤ سے پہلے آتا ہے)۔ یہ طریقہ بہت احسن ہے کیونکہ اس میں قافیے بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ ("منتخب اللغات" میں ایسا ہی کیا گیا ہے)۔ لیکن محاوروں، روزمرّوں وغیرہ کے لیے یہ طریقہ بھی نامناسب ہے، کیوں کہ ایک طرح کے محاورے ایک جگہ نہیں ملینگے۔ مثلاً "آنکھ" کی ضمن میں آنے والی کہاوت "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" تو الف مع لام میں ملینگی، اور "آنکھ ناک سے درست" کا روزمرّہ "الف مع ت" میں ملیگا، لہٰذا لغت کا ایک اہم تفاعل (ایک ہی طرح کے محاورے وغیرہ ایک جگہ درج کرنا) کم ہو جائیگا۔

۵۔ الفاظ کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے مشترک حروف کے اصول پر جمع کرنا۔ مشترک اصول کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ جمع کیے جائیں حروفِ تہجی کے اعتبار سے، اور ان کے اجتماع کی اندرونی ترتیب یہ ہو کہ جتنے حرف شروع میں مشترک آئیں ان کو نظر انداز کر کے پہلے حرف کے بعد مشترک حرف پر اجتماع کی بنیاد رکھی جائے۔ اس کی مثال ملاحظہ کیجیے۔

مستور، مستطیل، متار، مستبشر، مستظیر

یہ سب الفاظ میم کی تقطیع میں درج ہوں گے۔ چونکہ ان سب کے شروع میں م، س، ت مشترک ہے۔ اس لیے م، س، ت کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے گا کہ ان کے بعد پہلا حرف کونسا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "مستبشر" میں "ب" پہلے ہے "متار" میں "الف" پہلے ہے "مستظیر" اور "مستطیل" میں "ط" پہلے ہے اور "مستور" میں "واو" پہلے ہے لہٰذا ترتیب یوں ہوگی

متار ، مستبشر

اب دیکھا گیا کہ "مستطیل" اور "مستظیر" میں م، س، ت کے بعد "ط" اور "ی" بھی مشترک ہیں۔ اس لیے ان کی ترتیب "ی" کے بعد والے حرف کے اعتبار سے ہوگی یعنی "مستطیل" بعد میں اور "مستظیر" پہلے اور "مستور" سب سے بعد آئے گا یعنی اولین ترتیب تو پہلے حرف "م" کے لحاظ سے ہوئی اور بار بار یک ترتیب "م" کے بعد مشترک آنے والے حرف کو نظر انداز کر کے ان کے بعد والے پہلے حرف کے لحاظ سے یوں ہوگی :

متار، مستبشر، مستظیر، مستطیل، مستور

اس ترتیب میں مزید باریکی پیدا کرنے کے لیے زبر، زیر، پیش کا بھی لحاظ رکھ سکتے ہیں۔ یعنی "مثلاً" "م زبر" والے الفاظ کو پہلے رکھا جائے "میم زیر" والے کو اس کے بعد اور "میم پیش" والے کو سب کے بعد۔

ظاہر ہے کہ یہ طریقہ نمبر ۵ (اس مزید باریکی کے ساتھ جو اوپر بیان ہوئی) بہترین ہے۔ لیکن بنیادی شرط یہ ہے کہ ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہو اس لیے حروفِ تہجی کی تعریف طے کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ حروفِ تہجی کی عام تعریف تو یہ ہے کہ ہر وہ حرف جس سے کوئی لفظ شروع ہو سکتا ہو، حروفِ تہجی ہے۔ لیکن اردو

کے بعض حروفِ تہجی مثلاً ہمزہ، چھوٹی یے، بڑی یے "ڑ" اس تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ پھر حرفِ تہجی اس حرف (یا حرفوں کے اس مجموعے) کو کہہ سکتے ہیں، جو کسی ایک آواز کو ظاہر کرے (یعنی PHONEME)۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ بہت سے PHONEME ایسے ہوتے ہیں جو محض سننے میں آتے ہیں اور ان کی قیمت بدلتی رہتی ہے۔ (مثلاً "گڑھا" بروزن "فعل" میں "ڑ" اور "ہ" ملا کر ایک فونیم بنتا ہے لیکن اس کی قیمت وہ نہیں ہے جو "گاڑھا" میں "ڑھ" کی ہے، اگرچہ اس سے مشابہ ہے۔) لہٰذا PHONEME کو حرفِ تہجی فرض کرنا ممکن نہیں۔ ایک اور مثال۔ "لہر" جیسے الفاظ میں "ل زبر" کا سا تلفظ ہے، اس میں زبر ہے بھی اور نہیں بھی۔ اگر حرفِ تہجی کو کسی نظامِ تحریر کا قلیل ترین "ٹکڑا" مانا جائے، جو کسی آواز کو ظاہر کرتا ہے (یعنی GRAPHEME) کو تو مشکل یہ آتی ہے کہ اردو کے بہت سے مخلوط آوازوں والے مجموعوں (جو لکھا" میں "ھ" دودھ میں "دھ" وغیرہ کو بھی حرفِ تہجی ماننا پڑے گا۔ اور اگر "گھ"، "بھ"، "دھ" وغیرہ کو حرفِ تہجی مانا جائے تو "دھ پیش" "گھ پیش" کو حرفِ تہجی مان کر ان کی الگ تقطیع کیوں نہ قائم کی جائے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ حروفِ تہجی کا تعین اور تنظیم صوتیات یا علمِ تحریر کی بنا پر نہیں بلکہ رواج اور روایت اور تاریخ کی بنا پر ہے۔ اس رواج اور روایت اور تاریخ میں تبدیلی کرنا لغت نگار کا کام نہیں۔ اس کا یہ بھی منصب نہیں ہے کہ وہ زبان میں نئے حروفِ تہجی قائم کر دے۔ چنانچہ لغت نگار نہ تو یہ کر سکتا ہے کہ وہ دال کو بعد میں رکھے اور ڈال کو پہلے؛ اور نہ یہ کر سکتا ہے کہ حروفِ تہجی کی وہ فہرست جو زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی ہے، اس میں اضافہ یا تخفیف کرے۔ حروفِ تہجی کی فہرست میں اضافہ کرنا یا ان کی مروجہ ترتیب کو بدلنا، دونوں ہی باتیں انتشار اور اشکال کو راہ دیتی ہیں۔ لغت نگار چوں کہ الفاظ کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے جمع کرتا ہے (یعنی جس حرف سے جو لفظ شروع ہو، اسے اس حرف کی تقطیع میں رکھتا ہے) اس لیے اس کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان حروفِ تہجی کو نظر انداز کر دے، جن سے کوئی حرف شروع نہیں ہوتا (مثلاً ہمزہ اور "ڑ") لیکن ان کو نظر انداز نہ کرے جو حرف کے شروع میں آتے ہیں خواہ مصمتے کی شکل میں اس حساب سے دیکھا جائے

تو لغت میں جمع کیے جانے والے الفاظ مندرجۂ ذیل فہرست اور ترتیب پر جمع ہونگے:

ا، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی،

اور دوسرا اصول یہ ہوگا کہ اگرچہ لفظوں کے شروع میں کئی حرف مشترک ہیں، تو شروع کے حروف کی تقطیع کا لحاظ رکھتے ہوئے، مشترک حروف کو نظر انداز کرکے، ترتیب کی بنیاد مشترک حروف کے بعد جو حرف سب سے پہلے آئیگا، اس پر رکھی جائیگی۔ چنانچہ اگر کسی لفظ کے شروع میں دو "الف" ہیں تو وہ ان تمام لفظوں سے پہلے آئیگا، جن میں ایک الف ہو۔ اسی طرح اگر کسی لفظ کے شروع میں دو "جیم" ہیں تو وہ اس لفظ کے پہلے درج ہوگا جس میں "جیم" کے بعد "چ" ہوگی۔

مندرجۂ بالا اصول کی روشنی میں "آصفیہ"، "نور" اور "لغت" اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ الاپتی نظر آتی ہیں۔ "الف مد" کے بارے میں یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ دراصل دو الف ہیں۔ اس لیے، ظاہر ہے کہ وہ تمام الفاظ ہیں جن کے شروع میں "الف مد" ہو، ان لفظوں کے پہلے آئینگے، جس میں صرف ایک الف ہے۔ "آصفیہ" نے "الف مد" کو نظر انداز کر دیا ہے اور الف کے بعد "آ" اور "آ" کے بعد "اب"، اور "اب" کے بعد "آب" درج کیا ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ "الف مد" کو دو الف مان کر "آ" کو "اب" کے پہلے درج کرتی ہے لیکن دوسری طرف "الف مد" کو دو الف نہیں مانتی اور "آ" کے بعد "آب" کی جگہ "اب" درج کرتی ہے۔ پھر "آب" کے بعد "ابا" درج ہے، ابا کے نیچے "آبا" اس کے بعد "اباحت" پھر "آباد کار"، اس کے بعد "آبادانی"۔ یعنی کسی قسم کے اصول کا پتہ ہی نہیں لگتا جس کی روشنی میں لفظ تلاش کیا جائے۔ اگر "الف مد" کو دو الف فرض نہیں کرنا تھا، تو "الف" کے بعد "اب" آنا چاہیے تھا، نہ کہ "آ"، موجودہ صورت میں "آصفیہ" کی ترتیب الفاظ ایسی ہے کہ کسی لفظ کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کہاں ملیگا۔ "با" کی تقطیع میں "با" کو مستقل لغت بھی قرار دیا ہے اور "با" لاحقے کے ساتھ آنے والے محض چودہ لفظ درج کیے ہیں، جو "بااثر" سے لے کر "باوفا" تک پھیلے ہوئے ہیں (اس فہرست میں "باادب"

"بامراد" شامل نہیں ہیں) "بے" کا الگ لغت قائم کیا ہے ۔ اس میں "بے مزہ" درج ہے ، لیکن "با" کی ضمن میں "بامزہ" درج نہیں ہے ! "بے دل" ہے مگر "بے جگر" نہیں ہے ۔ لیکن لطف مزید یہ ہے کہ "بے" کو لاحقہ مان کر اس کے تحت "بے رخ ہونا" "بے غل و غش" تو درج کیا ہے ، لیکن "بے مات بھائی / بہن" کا لغت الگ قائم کیا ہے ۔ اور رات "بے ، ی ، م" کی تقطیع میں لائے ہیں ۔ معلوم ہوا "آصفیہ" کو ترتیب الفاظ کا کوئی خاص سلیقہ نہیں ۔ "نور" نے "الف مد" کو دو الف مانا ہے اور الف کے بعد "آ" اور "آ" کے بعد "آب" درج کیا ہے ۔ "نور" نے "الف" کے عنوان سے تقطیع ہی الگ رکھ دی ہے اور اس کے بعد دوسری تقطیع شروع کر دی ہے ۔ جس کا عنوان الف مقصورہ ہے ۔ اس طرح "نور" کا طریق کار "آصفیہ" کے مقابلے میں بہت زیادہ عقلی اور با اصول ہے ۔ لیکن "نور" نے نہ "الف مقصورہ" کو لغت بنایا ہے ، نہ الف ممدودہ کو ۔ اس لیے طالب علم "الف ممدودہ" سے ناواقف رہتا ہے ، اور "الف مقصورہ" کو حروف تہجی میں سے ایک مستقل حرف سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہو سکتا ہے ۔ پھر "نور" نے "آ" کو لاحقہ فرض کرتے ہوئے "آ بیٹھنا" "آبے" "آ پکڑنا" وغیرہ سب کو "آ" کے تحت درج کیا ہے حالانکہ ان محاوروں اور لغات میں "آ" کے معنی "زیادہ تر روز مرّہ اور سماعت پر مبنی ہیں ۔ "آ" اس معنی میں لاحقہ نہیں ہے ، جس معنی میں "بے" لاحقہ ہے کیونکہ "بے" بطور لاحقہ ہر جگہ "بغیر" کے معنی رکھتا ہے اور "آ" بطور لاحقہ فرض کیا جائے تو اس کے بھی ایک ہی مستقل معنی (یعنی "آنا کا امر") فرض کرنا ہوں گے ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔ "آبے" میں "آ" کے معنی استعاراتی اور مصدری ہیں ۔ ان سب کو الگ الگ لغت بنانا چاہیے تھا ۔ نہ کہ "آ" یعنی "آنا کا امر" کے ذیل میں ۔ بہر حال ان معمولی فروگزاشتوں سے قطع نظر "نور" کی "ترتیب الفاظ درست اور سہل الفہم ہے ۔

افسوس یہ ہے کہ ارباب لغت نے عقلی گروں کا جو سلسلہ باندھا ہے اس میں ترتیب الفاظ اور حروف تہجی کو بھی جکڑ لیا ہے اور ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ عقل دنگ اور ہوش گم ہو جاتے ہیں ۔ سب سے پہلی زیادتی تو انھوں نے یہ کی ہے کہ بزعم خود PHONEME کو حروف تہجی کا درجہ بخش دیا ہے ۔ لہٰذا ان کی فہرست کوئی دو ہاتھ لمبی ہو گئی ہے ۔ اور اس میں "آ" ، "رھ" ، "ڑھ" ، "مھ" ، "لھ" جیسے حروف بھی شامل ہیں ۔ خدا

معلوم دوچشمی ہ کو کیوں چھوڑ دیا، جس کے باعث ان مبیّنہ PHONEMES میں سے اکثر کا وجود ممکن ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ان میں سے بہت سے حروف لفظ کے شروع میں نہیں آتے، لیکن چونکہ ان کا مستقل آوازی وجود ہے، اس لیے ان سب کا "مجرّد حرف کے طور پر" اندراج کیا گیا ہے، اور ان کا "خاطر خواہ" تعارف کرایا گیا ہے۔ اوّل تو ان سب آوازوں کا PHONEME ہونا ہی مشتبہ ہے، لیکن اگر یہ PHONEME ہیں بھی، تو یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ مستقل حروف بھی قرار دیے جائیں، اور اس طرح حروفِ تہجّی میں غیر ضروری الفاظ کا اضافہ کیا جائے؟ اچھا اسے بھی مان لیتے ہیں کہ یہ مستقل حرف ہیں۔ لیکن "رہ"، "نھ" (زبر کے ساتھ) مستقل حرف ہیں، تو "رِہ" "رُہ" (زیر اور پیش کے ساتھ) اور "نِھ" اور "نُھ" (زیر اور پیش کے ساتھ) حرف کیوں نہ مانے جائیں؟ اس طرح تو ہمیں تمام ہکار آوازوں کے تین تین سیٹ قائم کرنے پڑینگے۔ پھر ان زیر اور پیش والے "حروف" کو کیوں ترک کیا؟ اچھا اسے بھی منظور کر لیا، لیکن اگر تمام PHONEMES کو حرف کا درجہ دینا ہے، تو "بہن" اور "احمد" جیسے الفاظ میں "ہ" کی جو آواز ہے اس کو حرف کا درجہ کیوں نہیں دیا؟ "تابع" اور "طارق" میں زیر کی آوازیں مختلف ہیں ان کو الگ حرف کیوں نہیں مانا؟ کسرۂ اضافت کو بھی الگ حرف کیوں نہیں مانا؟ اربابِ "لغت" نے PHONEMES اور GRAPHEMES وغیرہ کا نام سن لیا ہے اور فرض کر لیا ہے کہ جتنی آوازیں ان کو سنائی دیتی ہیں یا، دکھائی دیتی ہیں، وہ سب حرف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سی آوازیں (جن میں سے بعض کی مثالیں اوپر درج ہوئیں) ان کو سنائی بھی نہیں دیتیں۔

حروفِ تہجّی میں اضافے کی یہ کوشش نہ صرف قبیح اور غیر ضروری ہے، بلکہ غیر فطری اور غیر سائنسی بھی ہے۔ "بھ" "پھ" وغیرہ کو الگ حرف مان کر انھوں نے مزید زیادتی یہ کی ہے کہ ان کو "بے" کے بعد رکھا ہے۔ چنانچہ "بڑا" تو اپنی جگہ درج ہے، لیکن "بڑھا" کو "بڑے" کے بعد درج کیا ہے۔ ڈھونڈنے والا لاکھ سر مارے، اس کی سمجھ میں نہیں آئیگا کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہاے دوچشمی کو الگ حرف ماننے سے انکار بھی ہے، لیکن ہکار آوازوں والے GRAPHEMES کو حرفِ تہجی کی فہرست میں سب سے

آخر میں رکھنے پر اصرار بھی ہے۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

لیکن سب سے بڑی زیادتی اربابِ "لغت" نے بیچارے "الف" کے ساتھ کی ہے۔ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں: "ہم نے اپنی پہلی جلد کا آغاز الف مقصورہ سے کیا ہے، جب کہ تمام دوسری لغاتِ متداولہ ..... الف ممدودہ سے شروع ہوتی ہیں۔ دراصل الف ممدودہ دو الف کے برابر اور الف مقصورہ ہی کی موجودہ شکل ہے، لہٰذا ہمارے خیال میں اردو کا پہلا حرف مقصورہ ہی ہے۔" اول تو یہی بیان محلِ نظر ہے کہ اردو کے تمام متداول لغات الفِ ممدودہ سے شروع ہوتے ہیں، "آصفیہ" کی افراتفری ہم دیکھ چکے ہیں ــــ دوسری بات یہ ہے کہ "الف ممدودہ دو الف کے برابر" اور "الف مقصورہ ہی کی ممدودہ شکل ہے،" دو الگ الگ باتیں ہیں۔ اگر الف ممدودہ دو الف کے برابر ہے تو الف مقصورہ کی ممدودہ شکل کیسے ہو گیا؟ دونوں باتیں بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً کیا آپ کہہ سکتے ہیں جب حرف پر تشدید ہے، وہ دو حرف کے برابر بھی ہے اور اس حرف کی مشدّد شکل بھی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بولنے میں دو حرف کے برابر لکھنے میں اور اس حرف کی شکل ہے، لیکن دونوں باتیں ایک نہیں ہیں۔ اور الف کا تو معاملہ بھی دوسرا ہے۔ اگر الف "ممدودہ" کی تعریف یہ ہے کہ یہ الف مقصورہ کی ممدودہ شکل ہے، تو "الف مقصورہ کی تعریف یہ کیوں نہ ہو کہ یہ الفِ ممدودہ کی مقصورہ شکل ہے؟ اہلِ منطق نے ایسی ہی تعریف کو CIRCULAR کہہ کر اس سے پناہ مانگی ہے؟ ہمارے یہاں اس استدلال کو دندانِ تو جملہ در دہا نند۔ چشمانِ تو زیرِ ابروانند سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی "گز" کی تعریف یہ ہے کہ وہ پیمانہ جس میں تین فٹ ہوں، اور "فٹ" کی تعریف یہ کہ وہ پیمانہ جس کے تین مل کر ایک گز بنتا ہے۔ ارے صاحب، اگر الف ممدود دو الف کے برابر ہے اور اگر "الف مقصورہ" ایک الف ہے، تو "الف ممدودہ کو الف مقصورہ کی ممدودہ شکل" کہنے سے کیا مراد ہے؟

مصیبت یہ ہے کہ اربابِ "لغت" نے الفِ مقصورہ کی تعریف کہیں درج نہیں کی ہے۔ "الف مقصورہ" کے اندراج میں تحریر فرماتے ہیں، "رجوع کیجیے، الف"۔ "الف ممدود" کے ذیل میں لکھا ہے۔ چلیے "الف" کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہاں تحریر ہے۔ الف کی دو صورتیں ہیں مقصورہ اور ممدودہ، آخر الذکر کھینچ کر پڑھا جاتا ہے اور دو الفوں

کے برابر ہوتا ہے اور اس کے اوپر یہ علامت (ـــ) ہوتی ہے، جیسے "مد" کہتے ہیں۔ اللہ اللہ! کیا تعریف بنائی ہے! خدا کے لیے ان سے کوئی پوچھے کہ کھانا، روانہ، امداد میں جو الف "کھ"، "واؤ" اور "دال" کے بعد آیا ہے، وہ مقصورہ ہے کہ ممدودہ؟ اگر ممدودہ ہے تو اس پر مد کہاں ہے؟ اگر اس پر مد نہیں ہے تو اسے کھینچ کر کیوں پڑھتے ہیں؟ اور اگر مقصورہ ہے، تو یہ الف کھینچ کر کیسے پڑھا جائیگا؟ "آصفیہ" میں "الف مقصورہ" کی تعریف لکھی ہے "چھوٹی آواز کا الف"، وہ الف جو مد نہ رکھتا ہو" اور مثال میں "نانا" بھی درج کیا ہے۔ اب بیچارہ طالب علم کہاں جائے؟ کس لغت سے اپنا سر پیٹے؟ وہ کون سا "الف" ہے جو مقصورہ ہے، اور اردو کا پہلا حرف بھی ہے، اور "نانا"، "کھانا" جیسے الفاظ میں بھی آتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حرفِ تہجی کی حیثیت سے الف مقصورہ یا ممدودہ کا کوئی وجود نہیں کسی لفظ کے شروع میں ایک الف ہوگا، کسی کے شروع میں دو الف ہونگے۔ دو الف والے لفظ پہلے درج کیے جائینگے (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا)۔ اربابِ "لغت" نے "اب" سے لغت شروع کیا ہے اور "اوہاں" پر جلد ختم کی ہے۔ (خدا معلوم "اوہاں" کو "ایہاں" کے بعد کیوں رکھا ہے؟ کیا اس کے خیال میں "واؤ" کی ترتیب "ی" کے بعد ہے؟) پھر انھوں نے "آ" کی تقطیع شروع کی ہے، سارا معاملہ ہی پلٹ دیا۔ شاید ان کا خیال ہے کہ اگر نیا لغت ہے، تو اس میں بدعات کی کثرت لازمی ہے، ورنہ کیوں کر ثابت ہوگا کہ وہ اپنے فن سے واقف ہیں۔ حروفِ تہجی میں اضافہ اور ان کی بے اصول ترتیب اربابِ "لغت" کے ناقابلِ دفاع اقدامات ہیں۔
بات لمبی ہوتی جا رہی ہے؛ رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ لیکن مزید چند نکات کی طرف اشارہ کیے بغیر کام پورا نہیں ہو سکتا۔ اربابِ "لغت" کا خیال ہے کہ زبان میں مرادفات کا وجود نہیں؛ بعض الفاظ میں معنی کے اجزا ضرور مشترک ہوتے ہیں، لیکن دو ہم معنی الفاظ ممکن نہیں۔ یہ ادبی تنقید کا ایک کار آمد اصول ہے۔ لیکن اس کا اطلاق لغت نگاری تو کجا، تنقید پر بھی مکمل طور پر نہیں ہوتا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ای، ڈی ہرش کی کتاب THE AIMS OF INTERPRETATION جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ بعض حالات میں اور بعض مقاصد کے لیے دو عبارات بالکل متحد المفہوم ہوتی ہیں۔) لیکن یہ بات صحیح ہے کہ "لغت نگار کو معنی، مرادف، اور تعریف

کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بہت سے الفاظ (خاص کر محاوروں، روزمرّوں اور کہاوتوں) کے معنی بیان کرنا کافی ہے۔ ان کی تعریف لاحاصل اور مرادفات اکثر غیر ضروری ہوتے ہیں۔ بہت سے الفاظ کا مرادف دیے بغیر کام نہیں بنتا۔ مثلاً "شب" کا مرادف "رات" دیے بغیر چارہ نہیں۔ بعض اوقات مرادف اور معنی دونوں ایک ہی شے ہوتے ہیں۔ مثلاً "طلوعِ آفتاب" کا مرادف "سورج نکلنا" اس کے معنی بھی ہیں۔ یعنی مرادف ترجمے کا کام بھی کرتا ہے، اور معنی کا بھی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ معنی یا مرادف، جو بھی بیان کیے جائیں، ان میں غیر ضروری الفاظ نہ ہو۔ غیر ضروری افراط کی مثالیں "آصفیہ"، "نور" اور "لغت" تینوں میں کثرت سے ہیں۔ لیکن اربابِ "لغت" یہاں بھی گوے سبقت لے گئے ہیں۔ (مثالیں اوپر درج کر چکا ہوں)

مرادف لکھنے میں مشکل اس وقت آتی ہے، جب معنی اور مرادف اور ترجمے کی الگ الگ حیثیتوں پر غور کیا جائے۔ اکثر مرادفات ایسے ہوتے ہیں جو اصل لفظ کی جگہ استعمال نہیں ہو سکتے۔ مثلاً "باپ" کا مرادف "اب" ہے لیکن "باپ" کی جگہ "اب" استعمال نہیں ہو سکتا۔ "دروازہ" کا مرادف "باب" ہے لیکن "دروازہ" کی جگہ "باب" بہت کم استعمال ہو سکتا ہے۔ پھر بہت سے مرادف ایسے ہونگے جو اصل لفظ سے مشکل ہونگے یعنی "دروازہ" کے تحت محض "باب" لکھ دینے سے کام نہیں چلیگا کیونکہ اغلب ہے کہ جس شخص کو "دروازہ" کے معنی معلوم کرنا ہونگے، وہ "باب" سے بھی ناآشنا ہوگا۔ پھر معنی بیان کرنے کے لیے ان الفاظ و محاورات و امثال میں خاص احتیاط کی ضرورت ہوگی، جہاں اصل لفظ یا محاورہ کی جگہ ان کے معنی بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ مثلاً "سبز باغ دکھانا" کی جگہ اس کے معنی "لالچ دینا، فریب دینا" بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن "گل کھلنا" کی جگہ اس کے معنی استعمال نہیں ہو سکتے۔ لغت نگار کو ان تمام باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ خاص کر ایسے محاورے (جیسے گل کھلنا) جن کے معنی خاصے وسیع ہوں، ان کے معنی اور مثال میں عام محاوروں سے زیادہ تفحص اور احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

سب سے بڑا مسئلہ تعریف طلب الفاظ کا ہے۔ پرانے لغت نگار تو تعریف طلب الفاظ درج ہی نہیں کرتے تھے، یا محض ان کا عربی فارسی مرادف لکھ دیتے تھے، یا لکھتے تھے کہ "معروف است"۔ چنانچہ بہارِ عجم جیسے لغت میں "بت" کے معنی "صنم" درج ہیں "اور "بت کدہ"

"بتستان" وغیرہ کو لکھ دیا ہے کہ " ہر کدام معروف۔" ظاہر ہے کہ طالب علم پوچھ سکتا ہے کہ " اگر معروف بودے من معانی اس لغات را چرا جستجو کردے؟" لیکن اصولی سوال یہ ہے کہ ایسے الفاظ جن کے معنی لوگوں کو عام طور پر معلوم ہوں، ان کو درج ہی کیوں کیا جائے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس لیے درج کیا جائے کہ خدا معلوم یہ لفظ کب متروک ہو جائیں۔ (کس کو معلوم تھا کہ "ٹک" اور "سیتی" اور "ہور" اور "ہاڑ" اور "ذرہ" بمعنی "ذرا" جیسا کہ میر کے ہاں ہے (خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا) جیسے الفاظ متروک ہو جائینگے؟ دوسرا جواب یہ ہے کہ لفظوں کے معنی بدلتے رہتے ہیں، شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ (مثلاً حاتم نے "تاؤگے" کو "جلاؤگے" اور "دہے" کو "جلے" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اب "تاؤ" تو مستعمل ہے، لیکن مصدری معنی میں نہیں۔ اور "دہے" کے مصدری معنی ہی مفقود ہیں۔ محرّم کے دہے ضرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح میر نے "ناپیدا" لکھ کر "ناپید" مراد لیا ہے۔ اب "ناپیدا کنار" تو مستعمل ہے۔ لیکن مجرد "ناپیدا" کی جگہ صرف "ناپید" بولتے ہیں۔ الفاظ کو لغت میں درج کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ انھیں محفوظ کر لیا جائے۔ خاص کر آیندہ زمانے والوں اور غیر اہل زبان طالب علموں اور لسانیات اور علم اللسان کے ماہروں کو قدم قدم پر الفاظ کی تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا وہ الفاظ بھی جن کے معنی اغلباً سب لوگوں کو معلوم ہونگے، اور جن کے مرادفات خود اصل لفظ سے مشکل ہو سکتے ہیں، ان کو لغت میں درج کر کے ان کی تعریف بیان کرنا ضروری ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ طے کرنا ہی بہت مشکل ہے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں، اور ان کے کونسے معنی ہیں، جو اغلباً سب لوگوں کو معلوم ہونگے۔ لہٰذا شمولیت کا اصول انتخاب سے بہتر ہے۔

تعریف بیان کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ دو مثالوں سے بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔

"آنکھ"۔ اس کی تعریف لغات زیر بحث میں یوں درج ہے:

"آصفیہ" نین، نیتر، لوچن، دیدہ، چشم، بینائی کا آلہ۔ ظاہر ہے کہ "آصفیہ" نے تعریف کے نام پر ایک مہمل فقرہ (بینائی کا آلہ) لکھا ہے کیونکہ بینائی کا آلہ تو دوربین بھی ہے

اور عینک بھی اور کوئی بھی ایسی چیز جس سے دیکھنے کا کام لیا جائے، مثلاً وہ شیشہ جسے گھڑی ساز یا جوہر تراش استعمال کرتے ہیں۔ لفظ "آلہ" خود بھی گمراہ کن ہے۔ اس اعتبار سے "دانت" کو کھانے کا "آلہ" اور پاؤں کو "چلنے" کا "آلہ" کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک سوال مرادفات کا ہے، تو "دیدہ" آنکھ کا مرادف ہے بھی اور نہیں بھی۔ ایسے مرادف مزید گمراہ کن ہیں۔ مجرد "دیدہ" آنکھ کے معنی میں اردو میں نہیں آتا۔ مرکب شکلوں میں آتا ہے، ورنہ عورتوں کی زبان میں "آنکھوں کے لیے "دیدے" مستعمل ہے" "نین" اور "چشم" صحیح مرادفات ہیں، لیکن "نین" اب متروک ہے۔ "نینز" میں نے جدید اردو میں نہیں دیکھا، دکنی میں ہو تو ہو۔ غرض کہ صاحبِ "آصفیہ" کو "آنکھ" کی تعریف اور مرادفات دونوں میں دھوکا ہوا۔

"نور": دیکھنے کا عضو۔

یہاں بھی وہی حال ہے، بس یہ کرم کیا ہے کہ مرادفات سے جان بخشی کرا دی۔ لیکن دیکھنے کا "عضو" چہ معنی دارد؟ دیکھنے کا عضو، مگر کس کا؟ کس طرح کا۔ کیا شیشے کی آنکھ جس سے کچھ دکھائی نہیں دیتا، دیکھنے کا عضو ہے؟ اگر نہیں تو اسے "آنکھ" کیوں کہتے ہیں؟ دیکھنے کا اصل عضو تو آنکھ کا LENS اور پردہ یعنی RETINA ہوتا ہے، جس پر CORNEA اور LENS مل کر عکس ڈالتے ہیں، یہ چیزیں نہ ہونگی تو آنکھ پھر بھی رہیگی لیکن دکھائی کچھ نہ دیگا۔ پھر بہت سے Invertebrate جانداروں میں آنکھ اس طرح کی ہوتی ہی نہیں جیسی Vertebrate میں ہوتی ہے۔ بعض تو ایسے ہیں جن کے آنکھ ہی نہیں ہوتی، بلکہ تکونی شکل کے کئی LENS مل کر (جو دور دور ہوتے ہیں) "آنکھ" بناتے ہیں۔ لہٰذا یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔

"لغت": وہ عضو جس سے دیکھتے ہیں، آلۂ بصارت۔

یعنی صاحبانِ "لغت" نے "آصفیہ" اور "نور" کی مکھیوں کو پکڑ کر اپنے رنگ میں رنگ لیا اور اپنے پنجرے میں چھوڑ دیا۔ تعریف بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس شے کی تعریف کر رہے ہیں، اس کی جامع و مانع شکل بیان ہو جائے۔ ان تینوں لغات

کی تعریفیں اس صفت سے خالی ہیں ۔ صاحبانِ "لغت" نے شاید یہ اطمینان کر لیا ہے کہ O.E.D. میں EYE کی تعریف (THE ORGAN OF SIGHT) لکھی ہے ۔ لہٰذا ہم بھی وہی کریں ۔ وہ بھول گئے کہ ORGAN کے معنی "آلہ" نہیں، اور SIGHT اور چیز ہے ۔ "دیکھتے ہیں" یا "بصارت" اور چیز ہے ۔ انگریزی میں تو جانور کی نظر کو بھی SIGHT کہتے ہیں (مثلاً THE EAGLE HAS SHARP SIGHT یا THE TIGER HAS POOR SIGHT لیکن ہمارے یہاں کوئی نہیں کہتا کہ شیر کی بصارت کم زور یا عقاب کی بصارت تیز ہوتی ہے ۔ اردو میں ایسے موقعوں پر "نگاہ" یا "نظر" استعمال کرتے ہیں ۔ اربابِ O.E.D. تو SIGHT کہہ کر صاف بچ گئے لیکن ہمارے لغت نویسانِ کرام SIGHT کا صحیح ترجمہ "بصارت" کرنے کے باوجود غلطی میں رہے ۔ پھر O.E.D. نے Invertebrate جانوروں کی SIGHT کو الگ سے بیان کیا ہے RANDOM HOUSE نے وضاحت کر دی ہے کہ EYE وہ حصّۂ جسم ہے جس سے Vertebrate جاندار دیکھنے کا کام لیتے ہیں ۔ ان تمام تفصیلات کے بغیر تعریف نامکمل رہتی ہے ۔

دوسری مثال لیجیے : "بال" اس کی تعریفیں ان لغات میں یوں درج ہیں ۔

"آصفیہ" مُو ، شعر ، رُواں ، رونگٹا ، پشم ، کیس

سبحان اللہ، تعریف کے چکر ہی میں نہیں پڑے ۔ "شعر" عربی میں بال کے معنی میں ہے، اردو میں شاید کسی نے برتا ہو، اور اگر لکھا بھی ہے تو بہر حال "بال" سے بہت زیادہ نامانوس ہے، لہٰذا طالب علم کے لیے فضول ہے ۔ "رواں" ، "رونگٹا" "بال" ہرگز نہیں ہے ۔ "پشم" بعض جانوروں کے بال اور انسانوں کے موئے زہار کو کہتے ہیں ۔ "بال" کے مرادف کے طور پر اس کو لکھنا سیّد احمد صاحب ہی کے بس کا روگ تھا ۔ "کیس" اردو میں مستعمل ہی نہیں ۔ اب لے دے کر ایک "مو" رہ گیا، جو مجرّد "بال" کے معنی میں نہیں آتا ، ہمیشہ مرکّب آتا ہے، اس سے تو اچھا تھا کہ "بال" بیچارے کو مونڈ دیتے ، اندراج ہی نہ کرتے ۔

"نور" : مو ، رواں ، رونگٹا

ظاہر ہے کہ جو باتیں "آصفیہ" کے بارے میں کہی گئی ہیں، وہی یہاں بھی وارد ہونگی، اس سنگر گزاری کے ساتھ کہ "شعر" "پشم" اور "کیس" کو ترک کر دیا۔

"لغت": رواں، رونگٹا، مو، پشم، ریشہ (حیوان، نباتات کے جسم کا)

اس کو بھی "آصفیہ" اور "نور" پر قیاس کر لیجیے۔ کسی بھی لغت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ لمبی لمبی سی باریک چیز جو انسانوں اور جانوروں کے جسم پر اگتی ہے، "بال" کہلاتی ہے۔ تینوں میں سے کسی نے واضح نہیں کیا کہ "رواں" اور "بال" کسی طرح مرادف ہیں؟ "رونگٹے کھڑے ہو جانا" کی جگہ "روئیں یا بال کھڑے ہو جانا" کہاں کی اردو ہے۔ "رواں رواں دعا دیتا ہے" کی جگہ "بال بال دعا دیتا ہے" کس نے لکھا ہے؟ "بال بال قرض میں بندھا ہے" کی جگہ "رونگٹا رونگٹا قرض میں بندھا ہے" کہاں کی بولی ہے؟ قربان جائیے اس لغت نگاری کے۔

اب ایک آخری بات تاریخی اصول کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ "آصفیہ" اور "نور" نے یہ جھگڑا ہی نہیں رکھا ہے۔ اس لیے صرف "لغت" پر اظہارِ خیال کرونگا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اردو میں تاریخوں کا اس قدر فقدان ہے، اور جو تاریخیں ہیں بھی ان کے تعین میں اس قدر جھگڑا ہے کہ تاریخی اعتبار سے الفاظ کے معنی یا ان کے استعمال کے ارتقا کا بیان کرنے کی کوشش بڑی حد تک ناکام ہی ہو گی، ضروری بات یہ ہے کہ اگر تاریخی اصول کو برتنے کا دعویٰ ہی ہے، تو کم سے کم اس کو ممکن حد تک تو برتنا تھا۔ اربابِ "لغت" فرماتے ہیں: مثال درج کرتے وقت یہ بھی ضروری تھا کہ سن تصنیف یا مصنّف کا سن وفات درج کیا جائے۔ چنانچہ طے پایا کہ سن تصنیف اور مصنّف کے سن وفات میں سے جو قدیم تر ہو وہ درج کر دیا جائے۔ . . . بہرحال سنین کا دریافت کرنا بھی ایک علمی، تحقیقی اور خاصا طویل کام تھا، جسے بورڈ نے پوری کاوش سے انجام دیا ہے۔"

اصول بالکل صحیح، لیکن اس کو برتنے میں اتنی لاپروائی برتی گئی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ لاپروائی ہی صاحبانِ لغت کا اصول تھا۔ اور جہاں تک سنین کے دریافت

کرنے میں "پوری کاوش" کا معاملہ ہے، تو "لغت" دیکھ کر تمنّا ہوتی ہے کہ کاش اربابِ "لغت" نے پوری نہ سہی، صرف چوتھائی یا محض سرسری کاوش سے تو کام لیا ہوتا۔ موجودہ صورت میں سِنین کے اندراجات، اغلاط کی پوٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان میں دونوں طرح کے اغلاط ہیں یعنی تصنیف کا سنہ معلوم ہونے یا بآسانی معلوم ہوسکنے کے باوجود مصنّف کا سنہ وفات دے کر لفظ کی عمر کم کردی گئی یا سنہ ہی غلط دے دیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے "آصفیہ" کے تاریخی اغلاط پر ایک مبسوط مضمون حال ہی میں لکھا ہے۔ "لغت" کے تاریخی اغلاط پر تو ایک پوری کتاب مرتب ہوسکتی ہے بس پیٹنے کو جی چاہتا ہے کہ "اربابِ لغت" نے اس معمولی کاوش سے بھی کام نہ لیا، جو مجھ جیسے طالب علم بھی انجام دے سکتے ہیں؛ کجا کہ "پوری کاوش" جس کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ابراہیم یسند میں "خضرِ راہ" کا شعر نقل کر کے "بانگِ درا" کی تاریخ اشاعت (۱۹۲۴ء) نقل کی ہے، جب کہ سب کو معلوم ہے کہ "خضرِ راہ" کا سنۂ تصنیف ۱۹۲۱ء ہے

ابنائے زمان۔ سند میں غالب کا شعر نقل کر کے ۱۸۶۹ء لکھا ہے، جبکہ یہ شعر نسخہ حمیدیہ (کتابت ۱۸۲۱ء) میں شامل ہے۔

آنڈو۔ غالب کے خط کا جملہ نقل کر کے تاریخ وہی ۱۸۶۹ء لکھی ہے۔ خط قدر بلگرامی کے نام ہے اور ۱۸۵۷ء کے پہلے کا ہے۔

آگ۔ میر کا شعر نقل کر کے تاریخ ۱۸۱۰ء لکھی ہے۔ یہ شعر دیوان اوّل کے اس مخطوطے میں ہے جس کی تاریخ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء ہے۔ دیوانِ اول ۱۷۸۸ء کے پہلے مرتب ہوچکا تھا، لیکن قدیم ترین دستیاب نسخہ جو ۱۷۸۸ء کا ہے، عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔

بادۂ دوشینہ۔ غالب کا شعر نقل کر کے حسبِ معمول ۱۸۶۹ء ٹھونک دیا ہے۔ یہ شعر نبی بخش حقیر کے نام خط میں موجود ہے، جو ۱۸۵۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

بازار میں بٹھانا۔ مثال طلسم ہوشربا سے دے کر تاریخ ۱۸۹۲ء لکھی ہے، لیکن "بازارن"

کے ذیل میں کسی "انتخاب طلسم ہوشربا" سے کا حوالہ دے کر تاریخ ۱۸۸۸ء لکھی ہے۔
بِاس کرنا۔ میر کا شعر لکھ کر تاریخ وفات ۱۸۱۰ء درج کی ہے۔ یہ شعر بھی دیوانِ اول کا ہے اور ۱۷۸۸ء کے مخطوطے میں موجود ہے۔

الٰہی کارخانے ہیں۔ "نوراللغات" (جلد اول صفحہ ۳۹۹) کا حوالہ دے کر تاریخ ۱۹۴۲ء درج کی ہے۔ لیکن "الزام ملنا" میں "نوراللغات" (جلد اول صفحہ ۳۸۳) لکھ کر تاریخ ۱۹۳۴ء لکھی ہے۔ جو نسخہ میرے زیرِ نظر ہے اس پر تاریخ نومبر ۱۹۲۴ء چھپی ہوئی ہے۔

ابرو پھڑکنا۔ سودا کا شعر نقل کیا ہے:

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو پھڑک گیا
تیغا سا کچھ نظر میں ہماری سڑک گیا

"کلیاتِ سودا" جلد اول مرتبہ اکبرالدین صدیقی (لاہور، ۱۹۷۳ء) میں یہ شعر یوں ملتا ہے:

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو دھڑک گیا
تیغا سا کچھ ہماری نظر میں کھڑک گیا (صفحہ ۵۸۷)

اکبرالدین صدیقی کا خیال ہے کہ اس شعر کے بارے سے تعین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سودا ہی کا ہے۔ شعر سودا کا ہو یا نہ ہو، لیکن اکبرالدین صدیقی نے جو متن درج کیا ہے، اس کے اعتبار سے اربابِ "لغت" کا محاورہ اور سند دونوں غارت ہو گئے۔

افغان۔ سند میں مصحفی کا شعر دے کر تاریخ ۱۸۲۴ء درج کی ہے، جو مصحفی کی تاریخ وفات ہے۔ شعر دیوان اول میں موجود ہے جو ۱۷۸۵ء تک مکمل ہو چکا تھا۔

ارہ زبان۔ حوالہ "وضع اصطلاحات" کا دیا ہے، لیکن تاریخ (۱۹۲۱ء) نہیں لکھی۔

اعضا۔ اقبال کا شعر نقل کر کے "بانگِ درا" کا حوالہ دیا ہے، تاریخ ۱۹۲۴ء لکھی ہے۔ شعر "خضرِ راہ" میں ہے، جس کی تاریخ ۱۹۲۱ء ہے۔

اعصاب پر سوار رہنا۔ ضربِ کلیم کا حوالہ دیا ہے، تاریخ ۱۹۳۶ء کے بجائے ۱۹۲۷ء لکھی ہے۔

آ۔ امیر خسرو کا ایک شعر نقل کیا ہے، وہ بھی "فرہنگِ آصفیہ" کے حوالے سے سب جانتے

ہیں کہ سوائے ان چند مختصر عبارتوں کے جو امیر کے فارسی کلام میں ملتی ہیں، ان کا کوئی ہندوی کلام مستند نہیں"۔ "آ بڑے باپ کی بیٹی ہے تو پنجہ کرلے۔" "نجم الامثال" کا حوالہ دیا ہے لیکن تاریخ نہیں درج کی ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ "پنجہ کرنا" محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "مقابلہ کرنا"۔

ابرک کی ٹٹی۔ سند میں مثنوی میر حسن کا شعر لکھ کر تاریخ ۱۷۸۰ء لکھی ہے (جو مشکوک ہے) لیکن "آن" کے تحت اسی مثنوی کا شعر نقل کیا ہے اور تاریخ ۱۷۸۴ء لکھی ہے۔

بابلو۔ پریم چند کی "پریم چالیسی" کا حوالہ دے کر تاریخ ۱۹۳۶ء لکھی ہے، جو پریم چند کی تاریخ وفات ہے۔ کتاب کی تاریخ اشاعت (۱۹۳۰ء) درج کرنا تھی۔

باہر ہی باہر۔ یہاں بھی پریم پچیسی کا حوالہ ہے، تاریخ وہی ۱۹۳۶ء ہے کتاب کی تاریخ اشاعت (۱۹۳۵ء) آسانی سے دستیاب ہے۔ اس کے بہت سے افسانے "بتیسی" اور "چالیسی" میں شامل ہیں۔ یہ بھی تحقیق کرنا تھی کہ جس افسانے کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ ۱۹۳۵ء کے پہلے کا تو نہیں ہے۔

بریان۔ میر کا شعر نقل کر کے کسی کلیات کے صفحہ ۹۳۵ کا حوالہ دیا ہے، تاریخ حسبِ معمول وہی ۱۸۱۰ء ہے۔ شعر "دریائے عشق" میں ہے، جو میر کے لکھنؤ وارد ہونے (۱۷۸۲ء) سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔

بلبل شیراز۔ اقبال کا شعر نقل کر کے کسی کلیات کے صفحہ ۸۹ کا حوالہ دیا ہے اور تاریخ ۱۹۰۵ء لکھی ہے! اقبال کا خدا معلوم کون سا کلیات ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔ شعر دراصل "مرثیۂ داغ" کا ہے اور حوالہ کلیات کے صدی ایڈیشن کے صفحہ ۸۹ کا۔ خلطِ مبحث اسی کو کہتے ہیں۔

ادنی۔ پریم چند کی "گئودان" کا حوالہ دے کر تاریخ ۱۹۳۵ء لکھی ہے، جب کہ "گئودان" اردو میں ۱۹۳۹ء میں چھپی۔

اخلاص۔ ذوق کے مشہور سہرے کا شعر نقل کر کے تاریخ ۱۸۶۴ء لکھی ہے جو غالباً ۱۸۵۴ء (تاریخ وفات) کی جگہ طباعت کی غلطی ہے۔ لیکن غالب والے سہرے اور اس

سہرے کی تاریخ ایک ہی ہے یعنی ۱۸۵۱ء۔ یہاں ۱۸۵۷ء کی جگہ ۱۸۵۱ء چاہیے تھا یہ مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں "لغت" کے اور پہلو بڑی حد تک قابلِ استناد ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی تاریخیں سخت مخدوش ہیں، پھر مختلف تاریخوں سے مثالیں نقل کرنے کا فائدہ تب تھا، جب لفظ کے معنی میں وسعت یا تغیر ثابت کیا جاتا۔ موجودہ صورت میں تو اکثر الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مذکر، مونث میں یہ جھگڑا اور پیچیدہ ہو جاتا ہے "التفات" کی مثال اوپر درج کر چکا ہوں۔ یہی حال "ایجاد" کا ہے۔ یہ لفظ اب بالاتفاق مونث ہے۔ "لغت" نے مذکر، مونث دونوں درج کیا ہے۔ لیکن افراط و تفریط کا یہ عالم ہے کہ ۱۸۱۶ء، ۱۷۴۷ء، ۱۷۳۲ء، ۱۸۶۵ء، ۱۷۳۹ء، ان تاریخوں کے اسناد بالترتیب درج کیے ہیں، لیکن ان سے مذکر، مونث کچھ نہیں کھلتا۔ ۱۹۴۰ء کی سند اس کے بعد آتی ہے، اس سے مونث معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۱۷۸۰ء اور ۱۸۶۹ء کی مثالیں ہیں جو اس لفظ کو مذکر ثابت کرتی ہیں۔ بعدہ ۱۹۰۳ء، ۱۸۷۴ء اور ۱۹۲۲ء کی مثالیں ہیں جن سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ لفظ مذکر ہے یا مونث۔ "بابل" کی جو تعریف صاحبانِ "لغت" نے بیان کی ہے، وہ حد درجہ مضحکہ خیز بلکہ جہل ہے۔ لیکن ستم بالائے ستم یہ کیا ہے کہ اس کی بھی تذکیر و تانیث کا جھگڑا فیصل کیے بغیر چھوڑ دیا ہے۔ اس کو مذکر، مونث دونوں لکھا ہے، لیکن ۱۵۰۳ء کی مثال اسے مونث ثابت کرتی ہے اور ۱۷۰۷ء اور ۱۸۳۶ء کی مثال سے یہ مذکر معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۲ء کی مثال سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ لفظ بھی اب بالاتفاق مونث ہے، لیکن طالب علم کو اس کی تانیث کی کوئی جدید مثال فراہم نہ کر کے بڑی بے انصافی کی ہے۔

اس خامہ فرسائی سے اور کچھ ثابت ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بزرگوں نے اگر "ہر کارے و ہر مردے" صحیح کہا ہے، تو ابھی ہمیں اس مردِ غیب کا انتظار کرنا چاہیے جو اردو لغت کا کارے بکند۔ اس وقت تک کے تو تمام لغات نقص فکر اور نقل عمل کا نمونہ ہیں۔

ڈاکٹر عصمت جاوید

اُردو اور ہندی کی مشترک لفظیات میں فارسی اور مفرس عربی عناصر کا تجزیہ

ہندی اور اُردو کی مشترکہ لفظیات میں فارسی اور مفرس عربی عناصر کا تجزیہ کرنے سے قبل یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شمالی ہند میں ترک مسلمانوں کے ورود اور جدید ہند آریائی زبانوں کے وجود میں آنے کا زمانہ اتفاق سے ایک ہی ہے۔ اس لیے ہندی زبان کی تاریخ فارسی گو ترک مسلمانوں کی ہندستان میں آمد ہی سے شروع کرنی ہوگی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سبھی ہند آریائی زبانیں اپ بھرنش عہد سے نکل کر جدید عہد میں داخل ہونے لگی تھیں۔ محمود غزنوی کے حملوں کا سلسلہ ۹۹۹ء سے شروع ہوا اور پنجاب میں آل غزنہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک قائم رہی۔ مسلمانوں کی حکومت اور ان کی فتوحات کا دوسرا دور سلطنت دہلی کے قیام ۱۲۰۶ء سے شروع ہو کر ۱۸۵۸ء تک قائم رہا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے قیام سلطنت دہلی سے لے کر عہدِ عالمگیری کے ابتدائی برسوں تک کا زمانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عرصے میں جو چھ صدیوں تک پھیلا ہوا ہے صرف فارسی ہی ایک ایسی زبان ہے جس نے کئی جدید ہند آریائی زبانوں سے ربط میں آکر ان پر اہم اثرات ڈالے ہیں۔ یہ بات تو سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ اُردو اور ہندی دونوں کھڑی بولی ہی کے دو الگ الگ نکھرے ہوئے روپ ہیں۔ مذکورہ بالا عرصے میں جن زبانوں میں ادب

کی تخلیق ہو تی رہی ان میں برج بھاشا اور اودھی شامل تو ہیں لیکن اس زمانے میں کھڑی بولی کے ارتقا کی رفتار بڑی دھیمی رہی ہے۔ بھگتی کال میں جب برج اور اودھی ادب کے سنگھاسن پر جم گئیں تو ان کا اتنا بول بالا ہوا کہ ہندی زبان کے مورخوں نے ان زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب کا ذکر ہندی ادب کی تاریخ میں اس قدر تفصیل سے کیا ہے جیسے جدید ہندی انھی زبانوں سے نکلی ہو! سچ تو یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا زمانے میں نہ تو آج کے مفہوم والی ہندی پیدا ہوئی تھی اور نہ اردو کا دور دورہ تک بنا تھا۔ اس عہد میں ہندی اور اردو کی ماں کھڑی بولی میں جو بھی تھوڑا بہت ادب پیدا ہوا تھا اسے ہندی اور اردو دونوں کا قدیم اور ابتدائی روپ کہا جا سکتا ہے۔ اس دوران کھڑی بولی شمالی ہند میں برابر بول چال کی زبان رہی اور دکن میں اس ادب کی تخلیق بھی ہوئی لیکن چونکہ شمالی ہند میں اس زبان میں ادبی روایت کا سلسلہ قائم نہیں ہوا تھا یا اگر ہوا تھا تو وہ اب تک تحقیقات کی دسترس سے باہر ہے اس لیے شمالی ہند میں اس کے ارتقا اور اس پر فارسی کے اثرات کی نشان دہی کے سلسلے میں صرف قیاس ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵) سے کھڑی بولی کے ادب کی تاریخ کا آغاز کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندی میں ایک دیوان تیار کیا تھا لیکن یہ بات اتنی ہی مشکوک ہے جتنی یہ بات کہ پہلے ہندستانی فارسی شاعر مسعود سعد سلمان نے ہندی میں ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ امیر خسرو نے عوفی کے حوالے سے یہ لکھا تھا کہ مسعود سعد سلمان نے جس طرح تین دیوان فارسی، عربی اور ہندی میں قلمبند کیے تھے اسی طرح انھوں نے ایک ہی زبان میں تین دیوان مرتب کیے تھے۔ ان کے الفاظ میں "مسعود سعد سلمان اگرچہ سہ دیوانست اما آن دیوان درعبارت عربی وفارسی وہندیست درفارسی مجرد کسی سخن راسہ قسم نکردہ جز من (اگرچہ مسعود سعد سلمان کے تین دیوان ہیں لیکن وہ تین زبانوں عربی، فارسی اور ہندی میں ہیں۔ فارسی میں سوائے میرے کسی نے سخن گوئی کی تین قسمیں نہیں کیں)" ظاہر ہے کہ یہ تینوں دیوان تحفۃ الاصغر، وسط الحیات اور غرۃ الکمال فارسی میں ہیں۔ اور موخر الذکر دیوان کے دیباچے میں انھوں نے مذکورہ بالا بیان تحریر کیا ہے۔ رہی مسعود سعد سلمان کے ہندی دیوان کی بات تو خسرو کی معلومات کا ماخذ عوفی کا بیان ہے اور عوفی نے اپنا تذکرہ 'لباب الالباب'

مسعود سعد سلمان کی وفات (۵۱۵ھ) سے سو سال سے زائد عرصے کے بعد (۶۱۸ھ) میں لکھا تھا۔ مسعود سعد سلمان نے اپنے فارسی دیوان میں تو اپنی عربی دانی کا بار بار ذکر کیا ہے لیکن کہیں بھی اپنی ہندی دانی کا اشارہ تک نہیں کیا۔ اس سے مسعود کے فارسی دیوان کے مرتب رشید یاسمین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاید مسعود نے ہندی میں جو کچھ کہا اسے دوستوں میں بانٹ دیا۔ خود لکھتے ہیں "جزوے چند نظم ہندی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است" (کچھ ہندی شعر لکھ کر دوستوں کے نذر کر دیا) اس عوامی زبان کو اگر کسی نے گلے لگایا تو وہ صوفی تھے یا سنت۔ مراٹھی زبان کے مشہور شاعر سنت گیانیشور (۱۲۷۵ء) اور نام دیو (۱۲۷۰ لغایت ۱۳۵۰) نے کچھ پد اور ابھنگ کھڑی بولی میں لکھے ہیں جن میں کچھ فارسی اور مفرس عربی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب محمد تغلق دیوگری کو اپنی راجدھانی بناتا ہے اور دکن میں پہلی بار اجتماعی سطح پر کھڑی بولی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور یہ زبان فارسی کے غلبے اور برج اور اودھی کے ادبی اثرات کے دائرے سے دور مناسب ماحول پا کر جلد ہی پھلنے پھولنے لگتی ہے اور اس میں ادبی تخلیق کا کام تیزی سے ہونے لگتا ہے۔ یہ کھڑی بولی کا سنہرا دور ہے۔ اب تک نہ ہندی پیدا ہوئی تھی اور نہ اردو اس لیے اس دکنی کو ہندی اور اردو دونوں کا قدیم روپ کہا جا سکتا ہے۔ شمالی ہند میں کبیر اپنی نظموں کے ذریعے کھڑی بولی کو بھی بڑھاوا دے رہے تھے۔ گنگا بھٹ کی "چند چھند ورنن کی مہا" نامی کتاب عہد جہانگیری میں افضل جھنجھانوی کی 'بارہ ماسہ' اور شیخ باجن کی "زبان دہلوی" میں لکھی ہوئی ریختہ اور کچھ فارسی ہندی کے لغت۔ کھڑی بولی کی یہی کائنات تھی۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دہلی سلطنت سے لے کر عہد عالم گیری کے ابتدائی چند برسوں تک۔ برج، اودھی اور دیگر ہندستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی کے ارتقا کا زمانہ نہ تو موجودہ ہندی کے ارتقا کا زمانہ ہے اور نہ زبان اردو کی ترقی کا زمانہ، بلکہ ان دونوں زبانوں کے قدیم روپ کے ارتقا کا زمانہ ہے۔ اس زمانے تک اردو اور ہندی الگ الگ زبانیں نہیں بنی تھیں۔ عہد عالمگیری کے ابتدائی زمانے تک نہ تو اردو کا موجودہ روپ متعین ہوا تھا اور نہ اسے کسی ایک نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے کئی قدیم نام جیسے "زبانِ دہلوی" "ریختہ" "ہندی" "ہندوی" "ہندوستانی"

"زبانِ ہندوستان" "دکنی" اور "گجری" بتاتے ہیں کہ اس کی روپ ریکھا ابھی متعین نہیں ہوئی تھی اور جیسے ہی اس کا ایک متعین روپ بنا "اُردو" نام اس کے لیے مخصوص ہوگیا۔ لفظ "ہندی" مختلف علاقائی زبانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور خود "کھڑی بولی" بھی بعد کا دیا ہوا نام ہے۔

لسانیات کی رو سے دیکھا جائے تو ہندی اور اُردو دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں کیوں کہ دونوں کا اختلاف ان کی مشترکہ یا مختلف لفظیات سے نہیں بلکہ ان کی ساخت کے فرق سے ناپا جاتا ہے۔ اگر دو زبانوں کی نحوی ساخت ایک جیسی ہو، فعلی مادّوں کا ذخیرہ ایک ہو، ضمائر اور کلماتِ جار ایک ہوں، گنتی ایک ہو اور کہاوتوں اور محاوروں میں بڑی حد تک یکسانیت ہو تو دونوں زبانیں ایک ہی کہلائیں گی اس لیے ہندی اور اُردو صرف بہنیں نہیں بلکہ ایسی ہم شکل جڑواں بہنیں ہیں جو صرف اپنے الگ الگ لباس سے پہچانی جاتی ہیں۔ ایک نے یہاں کا پرانا لیکن قیمتی لباس پہن لیا تو دوسری کو بیرونی پوشاک پسند آئی جو غیر ملکی تو تھی لیکن اسے کاٹ چھانٹ کر اور ملکی رنگ میں رنگ کر اس نے اسے قبول کیا۔ جب یہ دونوں بہنیں اپنے گھریلو سادہ اور بے تکلف پہناوے میں دکھائی دیتی ہیں تو ایک کا دوسرے پر دھوکا ہوتا ہے اور دونوں کو ایک ہی سمجھ کر ہندستانی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ان دونوں کے بول چال کا روپ ایک ہی ہے کیوں کہ ان دونوں کی فعال لفظیات ایک ہی ہے جس میں پراکرت سے آئے ہوئے تدبھو الفاظ کی بہتات بھی ہے اور ایسے فارسی اور مفرس عربی دخیل الفاظ کی شمولیت بھی جنھیں ہندی اور اردو دونوں نے رچا پچا کر اس طرح اپنا لیا ہے کہ یہ بدیسی الفاظ ان کا جزو بن گئے ہیں اور ان میں صوتی، صرفی اور معنوی تبدیلیاں اس حد تک ہوئی ہیں کہ اگر یہ الفاظ اسی حالت میں اپنے وطن ایران جائیں تو ان کی صورت بھی پہچانی نہیں جائے گی بلکہ انھیں غیر ملکی سمجھ کر انھیں قبول بھی نہیں کیا جائے گا۔

دنیا کی کوئی زبان خالص ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی وہ چاہے سنسکرت جیسی دیوبانی ہو یا عربی جیسی مذہبی زبان جس میں قرآن اُترا ہے۔ خود قرآن میں تین ایسے غیر ملکی الفاظ ملتے ہیں جو سنسکرت سے مستعار بتائے جاتے ہیں۔ جیسے مسک (سنسکرت کا مُشکا)

کانور (سنسکرت کرپور) اور زنجبیل جو سنسکرت (शृंगवेर) کے عبرانی روپ Zanghebil سے زنجبیل بنا۔ سنسکرت میں بھی دراوڑ، چینی، یونانی اور پہلوی کے کچھ الفاظ ملتے ہیں۔ زبانوں میں الفاظ کے لین دین کی کہانی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ثقافت کی۔ لفظوں کا لین دین دو طرح کا ہوتا ہے۔ ثقافتی (Cultural) اور اتصالی (Intimate) ثقافتی لین دین سیاسی دباؤ کے تحت نہیں ہوتا اور نہ یک طرفہ ہوتا ہے۔ اتصالی عاریت یک طرفہ ہوتی ہے۔ فاتحوں کی زبان دین دار اور مفتوحوں کی زبان لین دار ہوتی ہے جو ایسے بدیسی الفاظ بھی مستعار لیتی ہے جن کے ہم معنی الفاظ اس میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ فارسی اور انگریزی ایسی دو غیر ملکی زبانیں ہیں جنھوں نے ہندستان کے عہدِ وسطیٰ اور عہدِ جدید کی زبانوں کو متاثر کیا ہے۔ فارسی زبان کے تحلیلی (Analytical) رجحان کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر باہری Presian Influence on Hindi میں لکھتے ہیں: اگرچہ پراکرت منزل میں اور اس کے پہلے بھی پراکرتوں میں تحلیلی رجحان کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ہمیں فارسی کے تحلیلی رجحانات کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا اور اس بات پر بھی توجہ دینی ہوگی کہ جو ہندستانی زبانیں فارسی سے جتنی قریب آئیں (جیسے لہندا، مشرقی پنجابی، مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بنگالی) وہ دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلے میں اتنی ہی زیادہ تحلیلی بن گئیں جیسے پنجابی ہندی سے اور ہندی زبان، گجراتی، مرہٹی اور بنگالی سے زیادہ تحلیلی ہے۔ ہندی کے کلمات جار "سے" "کو" "پر" وغیرہ کا مقابلہ فارسی کے "از" "را" اور "بر" سے کرکے دیکھیے تو یہ بات ثابت ہو جائے گی، نیز ہندی اور اُردو کے مرکب افعال جیسے 'چرانا' کے ساتھ ساتھ چوری کرنا۔ پوجنا کے ساتھ پوجا کرنا اور سینا کے ساتھ سلائی کرنا وغیرہ میں فارسی کے مرکب افعال کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنا مناسب ہوگا کہ جب کسی زبان میں دوسری زبان کا لفظ مستعار لیا جاتا ہے تو عام طور پر لین دار زبان اپنے صوتی نظام کی مطابقت میں اس کے تلفظ میں بھی تبدیلی کرتی ہے اور اس میں معنوی تغیر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح سیکڑوں الفاظ بغیر کسی شعوری کوشش کے فطری انداز میں ایک زبان سے دوسری زبان میں مستعار لیے جاتے ہیں۔ جب تک اردو نے مستقل روپ اختیار نہیں کیا تھا، کھڑی بولی میں فارسی کے سیکڑوں الفاظ صوتی تبدیلیوں کے بعد شامل ہوتے رہے اور

ان میں تھوڑا بہت معنوی تغیر بھی ہوتا رہا۔ فارسی کی کچھ آوازیں ہندستانی زبانوں کے لیے بالکل نئی تھیں جیسے /ز/ /ش/ /غ/ /ف/ /ق/ وغیرہ۔ فارسی نے عربی کی کچھ آوازیں مثلاً /ث/ /ص/ /ط/ /ظ/ کو چھوڑ دیا صرف /ق/ کو لے لیا۔ درحقیقت /ش/ ہندستانی زبانوں کے لیے نئی آواز تو نہیں تھی لیکن امتدادِ زمانہ سے بول چال کی سطح پر غائب ہوگئی تھی۔ جب فارسی الفاظ اودھی، برج، کھڑی اور راجستھانی وغیرہ میں آئے تو ان میں صوتی تبادل (Phonetic substitution) ہوا۔ /ز/ کی جگہ /ج/، /ف/ کی جگہ /پھ/، /خ/ کی جگہ /کھ/ اور /ق/ کی جگہ /ک/ نے لے لی۔ لیکن جب اردو نے اپنا انفرادی وجود پالیا تو فارسی سے قریب ترین اور طویل المدت تعلق کی وجہ سے اس نے فارسی کی اصل آوازوں کو اپنالیا اور پڑوسن ہونے کی حیثیت سے ہندی نے بھی ان صوتیوں کو بالخصوص /ز/، /ش/، /خ/ اور /ف/ کو قبول کیا اور دیوناگری میں انھیں علامتوں کے لیے ذریعے ممتاز کردیا لیکن ان آوازوں کے صحیح تلفظ پر وہی قادر ہو سکتے تھے جن کا اردو سے قریبی تعلق ہے اس لیے ان آوازوں کی ہندی میں اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اردو میں ہے۔ اردو آج بھی اپنے شین قاف سے پہچانی جاتی ہے۔ اردو نے ان آوازوں کو اس حد تک اپنایا ہے کہ وہ غیر فارسی الفاظ میں بھی ان صوتیوں کا استعمال کرتی ہے جیسے غنڈا، چھیڑخانی، فراٹا، پیخ، چٹخارہ، تقلہ، چرخ، زٹل، زوچکر، اکڑفوں وغیرہ میں۔

چونکہ اردو کا فارسی سے گہرا تعلق رہا ہے اس لیے فارسی اور مفرس عربی الفاظ کے تلفظ میں وہ دیگر ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں فارسی کے زیادہ قریب نظر آتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فارسی صوتیوں کی ہو بہو نقل کر سکتی ہے۔ یہ ممکن بھی نہیں۔ فارسی کے طویل مصوتے /ا/ کی ادائیگی میں منہ اتنا نہیں کھلتا جتنا اردو /ا/ کو ادا کرتے ہوئے کھلتا ہے۔ اگر لفظ 'جان' کے ایرانی تلفظ کو رومن رسم الخط میں لکھیں تو Jon ہوگا اور اردو تلفظ JA:N جیسے انگریزی تلفظ HA:F (Half) میں اسی طرح مختصر مصوتہ /ـُ/ ایرانی تلفظ میں مدور ہوتا ہے۔ بُردن (BORDAN) لیکن اس کا اردو تلفظ BURDAN ہوگا جیسے انگریزی لفظ Put یا Foot میں۔ اسی طرح بعض فارسی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے۔ جیسے الفاظ 'دیوانہ'

'پروانہ' وغیرہ میں ان کا ایرانی تلفظ کسرہ مجہول ए یا /ے/ अ کی طرح ہوتا ہے۔ دیوانَ / دیوانِ / پروانَ / پروانِ لیکن اُردو میں یہ /ے/ /ا/ بن جاتا ہے جیسے دیوانا، پروانا۔ یہی حال ان مفرس عربی الفاظ کا ہے جن کے آخر میں "تائے موقوف (ۃ) ہوتی ہے اس کا اصل تلفظ /ہ/ ہے لیکن اُردو میں یہ /ا/ میں تبدیل ہوجاتی ہے جیسے حادثہ = حادثا، جذبہ = جذبا۔ اسی طرح فارسی رفتہ (رفتِ)، گفتہ (گفتِ)، اردو میں 'رفتا' اور 'گفتا' بن جاتے ہیں اور فارسی بہ (جیسے بجا و بچشم) اُردو میں بجا اور بچشم بن جاتے ہیں۔

اُردو اور فارسی "تلفظ کا اختلاف مصمتی خوشوں کے سلسلے میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ سنسکرت، فارسی اور مفرس عربی الفاظ میں مصمتی خوشے پائے جاتے ہیں۔ سنسکرت الفاظ میں یہ جزو لفظی (Syllable) کی ابتدا اور آخر میں پائے جاتے ہیں جیسے پریم (प्रेम) مورکھ (मूर्ख) وغیرہ میں۔ فارسی اور مفرس عربی میں یہ ہمیشہ آخر میں آتے ہیں۔ اپ بھرنش عہد میں سہولت "تلفظ کے پیشِ نظر مصمتی خوشوں میں ٹوٹ پھوٹ کا عام رجحان پایا جاتا تھا جس کے نتیجے میں مشدد مصمتے ہاتھ لگے جیسے ستیہ (सत्य) سے سچّ یا کرم (कर्म) سے کمّ یا کسی مصمتی خوشے میں ایک مختصر مصوتہ /ہ/ کے تداخل سے اس کو توڑ دیا جاتا تھا جیسے بھرم (भ्रम) سے بھَرَم (भरम) دَھرم (धर्म) سے دَھَرَم (धरम) اور مورکھ (मूर्ख) سے مورَکھ (मूरख) کا بنا۔ اپ بھرنش کی یہ خصوصیت اُردو نے قائم رکھی۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے وہ بھی فارسی اور مفرس عربی الفاظ کے مصمتی خوشوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ دکنی میں فارسی اور مفرس عربی الفاظ کے مصمتی خوشوں کو توڑنے کا رجحان عام تھا جیسے شُکر کی جگہ شُکَر، مُلک کی جگہ مُلَک یا مُلُک۔ اور عدل کی جگہ عَدَل کا استعمال۔ انشا نے دریائے لطافت میں اس رجحان کو جائز قرار دیا ہے۔ کرخنداری بولی میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے جیسے مُفت۔ مُفَت؛ بخت۔ بخَت؛ عمر، عُمَر؛ عقل، عقَل؛ درد؛ درَد۔ نقد، نقَد؛ ظلم، ظلَم وغیرہ[1] ہندی۔ اُردو بول چال میں یہی رجحان ہے۔ البتہ اُردو کا پڑھا لکھا طبقہ اس

(1) Dr. Gopi Chand Narang: Karkhandari Dialect of Deli Urdu P. 47-49

رجحان کو مناسب نہیں سمجھتا بالخصوص ادبی زبان میں۔ یہ طبقہ ایک قدم آگے بڑھ کر ایسے الفاظ میں بھی مصمتی خوشے لے آتا ہے جو اصل زبان میں نہیں ہوتے جیسے مَرَض ، مرْض ، عَرَق ، عرْق ، قلَق ، قلْق ، شرَف ، شرْف ، تلَف ، تلْف ، نسَق (نظم ونسَق) ، نسْق (نظم ونسْق) اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انھیں اصل زبان میں ان الفاظ کے صحیح تلفظ کا علم نہیں ہوتا۔ اگرچہ اُردو کا تعلیم یافتہ طبقہ فارسی اور مفرس عربی الفاظ کے اصل مصمتی خوشوں کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہتا ہے۔ لیکن کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے مصمتی خوشوں کو قائم رکھنے میں وہ بے بس ہے۔ مثلاً ان الفاظ میں اصطبل (असतबल) غبن (ग़बन) ، چُغد ، فجر ، صِفر ، غدر وغیرہ میں جن کا اُردو تلفظ اصطَبَل ، غبَن ، چُغَد ، فجَر ، صفَر ، غدَر وغیرہ ہے۔ یہ تو پڑھے لکھوں کی بات ہوئی لیکن اُردو بول چال میں بالخصوص عورتوں کی زبان پر آج بھی مرَد ، برَف ، فرَق ، مُرَغ ، گرَم ، قسَم ، تخَت ، اصَل وغیرہ الفاظ ملتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندی بھی اس معاملے میں اُردو بول چال کے اس رجحان کی تقلید کرتی ہے۔

کھڑی بولی میں تشدیدی رجحان نمایاں ہے۔ اس کا اثر کچھ فارسی الفاظ کے اُردو تلفظ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جیسے چادر ، چدّر ، چمچہ ، چمّچ وغیرہ۔

اُردو میں فارسی اور مفرس عربی الفاظ کے مختصر مصوتے /زِ/ کو گرانے کا رجحان عام ہے۔ مثلاً خبَر (خ + ب + َ + ر) خبرِیں ، نظَر ، نظرِیں ، عمَل ، عملِی ، ادَب ، ادَبی اور قلَم ، قلمی بن جاتے ہیں۔ ادبی زبان بالخصوص نظم میں یائے توصیفی یا یائے نسبتی کے بعد بھی اس مختصر مصوتے کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (یعنی ادَبی ، قلَمی وغیرہ پر اصرار کیا جاتا ہے)۔ ہندی ایسا نہیں کرتی۔

ہندی۔ اُردو میں جن فارسی اور مفرس عربی الفاظ کو اپنا لیا گیا ہے ان پر جنس و تعداد کے وہی 'قانون' نافذ کیے گئے ہیں جو دوسرے الفاظ پر جاری ہیں ہندی اور اُردو ان غیرملکی الفاظ میں بھی وہی پابند صرفیے (Bound Morphemes) جوڑتی ہیں جو وہ دوسرے غیرفارسی الفاظ کے ساتھ متصل کرتی ہیں۔ بچّہ ، بچّے ، ہوا ، ہوائیں ، تصویر ، تصویریں ، اس طرح جملوں میں ان کے ساتھ وہی صرفیے بھی جوڑے جاتے ہیں جو دیسی الفاظ کے ساتھ لگائے جاتے ہیں جیسے :

آدمی نے ، آدمیوں نے ر سے ر پر ر تک
عورت نے ، عورتوں نے ر سے ر پر ر تک
اس سے پتا چلتا ہے کہ اُردو اور ہندی نے ان الفاظ کو ملکیا لیا ہے۔
فارسی میں غیر ذوی العقول کی جنس نہیں ہوتی۔ عربی میں ہندی اور اُردو کی طرح بے جان اشیا پر دلالت کرنے والے اسما کی بھی جنس ہوتی ہے۔ ہندی اور اُردو نے ان غیر ملکی اسما کی جنس اپنے مزاج کے اعتبار سے متعین کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اِن الفاظ کی جنس میں (اصل زبان کی جنس سے بے نیاز ہوکر) وہی اشتقاقی لاحقے (DERIVATIONAL Suffixes) استعال کرتی ہیں جو وہ دوسرے (ملکی) اسما کے ساتھ کرتی ہیں جیسے اشتقاقی لاحقہ {-ی} کا استعال۔

دیوانہ ، دیوانی ، شہزادہ ، شہزادی ، بچّہ ، بچّی ، بندہ ، بندی ، کبوتر ، کبوتری ، بیچارہ ، بیچاری ، تازہ ، تازی۔

{ان ر آن ر ان ر نی ر انی} کا استعال:

(۱) داروغہ ، داروغن ، ضدّی ، ضدّن ، حبشی ، حبشن ، مالک ، مالکن۔
اُردو داں عورتوں کے نام بھی امامن ، نصیبن ، کریمن وغیرہ ہوتے ہیں۔
(۲) شاعر ، شاعرنی ، فقیر ، فقیرنی ، دیو ، دیونی ، جادوگر ، جادوگرنی ، مزدور ، مزدورنی۔
(۳) مہتر ، مہترانی ، مثل ، مغلانی ، اُستاد ، اُستانی ، نوکر ، نوکرانی۔
کچھ الفاظ جو اصل زبان میں جمع ہیں اُردو میں واحد مستعمل ہیں جیسے:
دیہات ، اولاد ، اصول ، اولیا ، خیرات وغیرہ۔ ہندی میں بھی یہ الفاظ واحد ہیں۔
کرگھا جو فارسی میں کارگاہ تھا صوتی تبدیلی کے بعد اُردو اور ہندی میں کرگھا بنا۔
تعمیر الفاظ کے سلسلے میں ہندی اور اُردو نے ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی لاحقے استعال کیے ہیں جیسے دان سے پاندان ، اگلدان ، پھولدان ، چوہے دان۔
تانیث میں مچھر دانی۔
ترکی لاحقہ چی سے ڈھنڈورچی ، نیچی۔
دار سے ٹھیکیدار ، پہیے دار ، پہرے دار ، دھاری دار ، گرجدار ، چمکدار وغیرہ

باز سے دل لگی باز، پتنگ باز، بٹیرباز، نخرے باز۔

خور/خورا سے بیاج خور، میل خورا، شیخی خور۔

یہی نہیں بلکہ ان غیر ملکی الفاظ کے ساتھ ہندی اشتقاقی صرفیے بھی لگائے جاتے ہیں۔

{= یلا} شرم سے شرمیلا، نشہ سے نشیلا، جوش سے جوشیلا، زہر سے زہریلا، برف سے برفیلا۔

{ہٹ} نرماہٹ، گرماہٹ۔

{= یا} سرود سے سرودیا، کبابیا۔

{پن} دیوانہ پن، جوشیلا پن، کمینہ پن۔

اُردو اور ہندی میں چتکبرے مرکبات بھی ملتے ہیں جن کا ایک جزو فارسی تو دوسرا ہندستانی جیسے جھاڑ فانوس، پارسال، ڈاک خانہ، پاگل خانہ، جل پری، سبزی منڈی، چور بازار، دانہ پانی، مرہم پٹی، ناک نقشہ وغیرہ۔ اسمائے خاص میں اقبال سنگھ، مالک رام، گلاب سنگھ وغیرہ۔ شہروں کے نام میں احمد نگر، برہان پور، علی گڑھ وغیرہ۔ ہم معنی مرکبات جیسے خط پتر، دھن دولت، بھینٹ ملاقات، ساگ سبزی، رانڈ بیوہ وغیرہ

دیکھا دیکھی کے وزن پر: گرما گرمی، بخشا بخشی، شرما شرمی، ادلا بدلی۔

تابع مہمل پر مشتمل مرکبات: ادل بدل، الا بلا، اغل بغل، غلط سلط، غبن وبن، شادی وادی وغیرہ۔

اُردو کی طرح ہندی نے کچھ فارسی افعال اور عربی الفاظ سے بھی افعال وضع کیے ہیں جیسے خریدن سے خریدنا، آزمودن سے آزمانا وغیرہ۔ عربی بدل سے بدلنا۔

ہندی اور اُردو میں فارسی اور مفرس عربی دخیل الفاظ کے اندر معنوی تغیرات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ہندی اور اُردو کا تعلق ایران میں بولی جانے والی فارسی سے نہیں بلکہ اُس فارسی سے تھا جو ہندستان میں رائج تھی۔ اس ہندستانی فارسی کے اندر ایرانی فارسی کے الفاظ میں جو صوتی و معنوی تغیرات ہوئے تھے انھیں ہندی اور اُردو نے جوں کا توں لے لیا۔ لفظ 'غریب' نہ تو عربی اور نہ فارسی میں 'مفلس' کے معنوں میں آتا ہے۔ اسی طرح عربی میں امیر کے معنی حاکم (صاحب امر) یا کمانڈر کے ہیں۔ ایران میں بھی یہی معنی رہے۔ ہندستان آکر

یہی 'حاکم' مالدار بن گیا۔ فارسی میں 'آوارہ' صرف 'بے گھر' مارا مارا پھرنے والا تھا۔ ہندی اور اُردو میں بدمعاش اور لچّا بن گیا۔ عربی میں 'حرامی' صرف چور یا لٹیرا تھا۔ اُردو۔ ہندی میں ناجائز اولاد بن گیا۔ عربی میں 'رقم' کا تعلق صرف لکھنے سے تھا پھر ہندسہ بنا اور ہندی اور اُردو میں 'دھن دولت' کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ 'داغ' فارسی میں جلنے کا نشان تھا' اُردو اور ہندی میں ہر دھبّہ داغ بن گیا۔ یہ توسیع معنی (Extension of Meaning) کی مثال ہے۔ فارسی میں 'مُرغ' عام پرندے کو کہتے ہیں۔ اُردو اور ہندی نے اس کے معنی محدود کرکے مُرغا اور مُرغ بنادیا۔ فارسی میں ہر بڑی چیز 'بزرگ' ہے' اُردو میں یہ معمّر اور قابلِ احترام ہستیوں کے لیے وقف ہوگیا۔

اُردو۔ہندی کی کچھ کہاوتیں ایسی ہیں جن میں کسی فارسی یا مفرّس عربی لفظ کو قافیے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

کر سیوا تو کھا میوہ' چوری اور سینہ زوری' اونچی دکان پھیکا پکوان۔

مختصر یہ کہ ہندی اور اردو نے جو فارسی اور مفرس عربی عناصر اپنی لفظیات میں شامل کیے ہیں ان میں صوتی' صرفی اور معنوی تغیرات یا ان میں سے کوئی ایک تغیر ہوا ہے۔ یہ اب ہمارے لیے غیر ملکی الفاظ نہیں ہیں بلکہ بھارتی شہری ہیں اور ہماری زبانوں — ہندی اور اُردو — کا اقتدار تسلیم کرنے پر پابند۔ اب یہ ہمارے ہیں اور ہم میں سے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ذاکر

معیاری اُردو لغت : ایک خاکہ

زیرِنظر مضمون میں میں نے اپنے خیالات کو ایک ایسی عام 'یک زبانی' Mono-lingual یا Single-language اُردو لغت کی ترتیب و تدوین تک محدود رکھا ہے جو بیک وقت عام قاری کے لیے بھی مفید ہو اور عالم کے لیے بھی۔ عام لغت سے میری مراد یہ ہے کہ اُس کے مندرجات کسی ایک مخصوص علم یا کاروبار کی اصطلاحوں تک یا محض اُردو ادب کے شاہکاروں تک محدود نہ ہوں؛ نہ ہی اس وقت میرا سروکار جیبی اور قاموسی لغات سے ہے۔ میرے ذہن میں تو اس وقت ایک ایسی معیاری توضیحی اُردو لغت ہے جسے Desk-dictionary کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس میں مروّجہ زبان اس طرح محفوظ ہو کہ ہر ایک اس سے استفادہ کر سکے اور اس کی ضخامت اس استفادے میں مانع نہ آئے۔

عام آدمی کی حیثیت سے بھی اور اپنے پیشے کے اعتبار سے بھی میرا واسطہ الفاظ اور ان کے مفاہیم و مطالب کی تعیین سے رہتا ہے ــــــ الفاظ جو انسانی خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور الفاظ ہی سے لغت بھی متعلق ہوتی ہے۔ لیکن الفاظ ہیں کیا؟ یہ لسانی صورتیں ہیں، مختلف انسانی آوازوں کے مجموعے جو ایک عرصے تک کسی ایک مخصوص جغرافیائی علاقے میں یکجا رہنے والے افراد کے اپنے مافی الضمیر کو ایک دوسرے پر ظاہر کرنے میں پہلے سے کسی بنائے ہوئے

اصول کے بغیر وضع ہو جاتے ہیں۔ الفاظ سازی کے کسی سوچے سمجھے اصول اور ضابطے کے بغیر ہی ان افراد میں غیر شعوری طور پر یہ سمجھوتہ سا ہو جاتا ہے کہ ان کے مُنہ سے اراداتاً نکلنے والی مخصوص آوازوں ـــــ مثلاً ہونٹوں سے نکلنے والی، ہونٹوں اور دانتوں سے مل کر نکلنے والی، حلقوم سے ٹکرا کر آنے والی اور ایسی ہی دوسری آوازوں کے مجموعوں کے الگ الگ خاص مطلب یا معنی ہوتے ہیں۔ [یہاں میرا مقصد الفاظ اور انسان کے ادراک و آگہی اور عرفان سے متعلقہ مسائل پر بحث کرنا نہیں ہے]۔ الفاظ کے الگ الگ باہم ممتاز و ممیز معانی کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ جیسا کہ تمام ماہرین لسانیات اور وہ لوگ جو زبان کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں یا جن کا کام زبان کے ایسے استعمال کی پرکھ اور حسن شناسی ہے بخوبی جانتے ہیں کسی بھی زبان میں دو لفظ بالکل مترادف نہیں ہوتے۔ مترادف سے مترادف الفاظ میں بھی کچھ نہ کچھ درجاتی کیفیت کا فرق ضرور ہوتا ہے جسے ہم ہندستانی میں ایک حد تک اُنیس بیس کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات واضح ہو جائے گی اگر ہم غور کریں کہ ایک لفظ کے محاورے میں استعمال یا اس کی ادائیگی میں لہجے کے فرق کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو مختلف الفاظ کے ساتھ مل کر وہ الگ الگ معنی دے سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی بول یا فقرے میں اس کی جگہ بدل دینے سے بھی اس کے مطلب یا مفہوم میں تبدیلی آسکتی ہے۔ اس لیے لغت میں مندرج الفاظ کے مختلف رنگ یا معنوی پہلو اور ان کا محل استعمال ضرور دکھانا چاہیے کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ لغت اُترتے چڑھتے ہم معنی الفاظ کی فرہنگ یا Thesaurus نہیں ہوتی یعنی لفظوں کی ایسی فہرست نہیں ہوتی جس میں ہر ایک مندرج لفظ یا Entry یا Lexical unit کے مقابل اُسی مفہوم کے دیگر ملتے جلتے الفاظ جمع کر دیے جائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ معانی کی تعریف و توضیح میں انتہائی قطعیت ہو۔ اگر جارج اور ویل کے الفاظ مستعار لے سکیں تو کہہ سکتے ہیں کہ لغت کو معانی کے مختلف رنگوں سے پاک صاف نہیں رکھنا چاہیے۔ لغت میں دراصل الفاظ کے سیاقی معانی کے تعین سے سروکار ہوتا ہے یعنی کسی لفظ کے کیا کیا سیاقی معنی ہو سکتے ہیں۔ لفظ کے سیاقی معنی سے مُراد یہ ہے کہ وہ لفظ

اہل زبان اپنی روزمرہ کی زندگی میں مختلف موقعوں پر کس کس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ لغت میں ان معانی میں سے کس کو پہلے درج کیا جائے گا اور کس کو بعد میں؟ مندرجات یا Lexical units کے انتخاب کی طرح اس کا دارمدار بھی اس بات پر ہوگا کہ اس زبان کے بولنے والے انھیں کتنا زیادہ اور کتنا کم استعمال کرتے ہیں۔

ان مختلف سیاقوں کا تعین کرنے کے لیے لغت نگار کو اس پر بھی نظر رکھنی ہوگی کہ اس نوع کے کام کرنے والے دوسرے لوگوں نے اپنی تحقیقات سے کیا نتائج نکالے ہیں اور اس پر بھی کہ خود اس کی تحقیق کیا کہتی ہے۔ اس لیے اس زبان کے شعری اور نثری سرمائے اور معروف اور نسبتاً کم معروف تحریروں سے اس کا اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے کیوں کہ اس کی تحقیق کے بنیادی ماخذ بہرحال یہی ہیں۔ یہی وہ مسالا ہے جسے اُس زبان کے بولنے والوں میں ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اس کی مرتب کردہ لغت خود اس سے زیادہ عالمانہ ہوگی۔

مندرجات یا الفاظ لغت کے انتخاب اور ان کی ذیل میں کس قسم کی واقفیت بہم پہنچانی چاہیے اسے آسانی کے لیے ان عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) ہجے اور تلفظ (۲) و (۳) اجزائے کلام (یعنی اسم، فعل، حرف وغیرہ) اور تصریفی صورت (۴) اشتقاق (۵) الفاظ لغت کی تعریف وتشریح و توضیح اور (۶) مترادفات۔

ان پر بحث کرنے سے پہلے ہم لغت کے سرآغاز یا Front matter کا ذکر کرتے چلیں۔ لغت نگاری میں سب سے پہلے آوازوں اور ان کی تحریری علامات (حروف) نیز حرکت اور سکون کے لیے املائی نشانات کا تعین ضروری ہے۔ مختلف مُصوتی اور مُصمتی آوازوں کے لیے جو حروف اور املائی نشانات لغت نگار نے متعین کیے ہیں انھیں مع مثالوں کے لغت کی ابتدا ہی میں نمایاں طور پر ظاہر کردینا چاہیے۔ ضروری ہے کہ یہ علامات باہم ممیز و ممتاز ہوں اور

صوت تجزیاتی اصولوں پر مبنی ہوں اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ہر مندرج لغت (Lexical unit) کا تلفظ ظاہر کرنے کے لیے ان ہی علامات کو استعمال کیا جائے۔

(۱) ہجّے اور تلفظ: میرے خیال میں اُردو لغات میں مندرجات یا الفاظ لغت کے ساتھ علیحدہ سے تلفظ کی صراحت ضروری نہیں ہے کیوں کہ مندرج لفظ (Lexical unit) ہی کے حروف پر املائی / ہجائی نشانات واضح طور پر قائم کر دینے سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ الف مقصورہ والے الفاظ لغت (مثلاً عیسیٰ، موسیٰ وغیرہ) کو البتہ مستثنیات میں شمار کر کے ان کے تلفظ کی صراحت علیحدہ قوسین میں کرنی ہوگی۔ اسی طرح ان مرکّبات میں جن میں عربی کے حرفِ تعریف کے الف اور 'ل' نہ پڑھے جاتے ہوں (یعنی شمسی حروف سے شروع ہونے والے الفاظ) ان میں ایسے الف اور 'ل' پر (×) نشان قائم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نظام الدین کے تلفظ کی صراحت قوسین میں اس طرح کی جائے (نظامُدّین)۔ اسی طرح قمری حروف والے مرکبات میں 'ی' اور الف پر (×) نشان دیا جائے اور ان کے تلفظ کی صراحت قوسین میں کر دی جائے مثلاً "فی الحقیقت" کے تلفظ کی صراحت اس طرح ہو (فِل حقیقت)۔

لغت میں مندرجات یا الفاظِ لغت کے عام اور غیر فصیح تلفظ کا دینا بھی ضروری ہے اور اگر وہ کسی دوسری زبان سے لیے گئے ہوں تو ان کا ماخذ بھی۔ مثلاً لفظ "نیلام" کے صحیح تلفظ اور اس کے ماخذ یعنی پرتگالی کی نشاندہی کے بعد اس کا عام اور غیر فصیح تلفظ "نِیلام" یا "لِلّام" بھی دینا ضروری ہے۔ (اسی طرح لفظ "فصیل" کے ساتھ اس کا غیر فصیح تلفظ "سفیل")۔

اُردو لغت میں پرانی فارسی لغات کی روایت میں الفاظِ لغت کی املائی صراحت میں حروف کے نام مثلاً بائے عربی، تائے فوقانی لکھنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن تلفّظ کی صراحت میں سب سے زیادہ ضروری بات "جزم" کا نشان لگانا ہے کیوں کہ یہ لفظ کی رکن واری تقسیم کا بے حد مفید ذریعہ ہے۔ جہاں مصمتی خوشہ (Consonantal Cluster) واقع ہو وہاں ایسے تمام خوشہ بند حروف، پر جزم کی نشانی ظاہر کرنی چاہیے۔ اسی طرح الفاظِ مندرج میں

مُشدّد حروف کی حرکات کے ساتھ تشدید بھی لازمی طور پر ہونا چاہیے۔

(۲) و (۳) اجزائے کلام اور تصریفی صورتیں: لغت کے مندرج الفاظ (Lexical units) اسم بھی ہوسکتے ہیں، صفت یا فعل وغیرہ بھی۔ اس لیے ان کی پوری تصریح ہونی ضروری ہے۔ اگر کسی اسم کا صیغۂ جمع، جمع بنانے کے عام قاعدوں کی ذیل میں نہیں آتا تو اُسے بھی قوسین میں لکھ دینا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر کچھ اسما کے صیغۂ جمع کے معانی ان کے صیغۂ واحد کے معانی سے مختلف ہوں تو انھیں بھی شامل کرنا چاہیے (مثلاً لفظ صلوٰۃ کے معنیٰ 'نماز'، مسلمانوں کی عبادت کا ایک طریقہ مگر اس کی جمع "صلواتیں" کے معنی "بے عزتی" یا "گالیاں") پھر مندرج اسما کے ساتھ تذکیر و تانیث کے اشارے بھی ہونے ضروری ہیں کیونکہ اُردو میں صحیح جملوں کی ساخت میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔

مصادر کی صراحت میں لازم اور متعدی کی نشان دہی تو ضروری ہے ہی ان کے قیاسی اور سماعی ماضی (مطلق) بھی دینے چاہییں۔ مثلاً "کرنا" کے ماضی "کیا" کے ساتھ "کرا" اور "کریا" بھی درج کیے جائیں۔

(۴) اشتقاق: مجوزہ عام اُردو لغت میں مندرجات کی از اول تا آخر تاریخ دینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس میں ان کے ماخذ کی نشان دہی ضرور ہونی چاہیے۔ یعنی مندرج لفظ اصل میں کس زبان کا ہے اور جہاں ضروری ہو یہ بھی نشان دہی کی جائے کہ یہ کس زبان کے واسطے سے اُردو میں آیا ہے مثلاً بہت سے ترکی الفاظ اُردو میں فارسی کے توسط سے آئے ہیں۔ اس کی طرف لغت میں اشارہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مختلف زبانوں کے لیے مخففات متعین کیے جائیں اور ان کو لغت کے آغاز و تعارف ہی میں واضح کر دیا جائے۔ پھر اگر کسی زمانے میں مندرج لفظ کی صورت اور معنی میں کوئی تغیر ہوا ہو اور اس کا ثبوت بھی موجود ہو تو اس کی طرف اشارہ کیا جانا چاہیے۔ گویا مجوزہ اُردو لغت میں صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے الفاظ کے ارتقا کی نشان دہی ہونی چاہیے تاکہ اس میں مندرج الفاظ کے اشتقاقی پہلو پر بھی روشنی پڑے اور تاریخی پہلو پر بھی۔ مثلاً مندرج لفظ "بات" کی ذیل میں دیگر معلومات کے علاوہ

یہ نشان دہی بھی کی جائے کہ سنسکرت میں اس کی صورت "وارتا"، پراکرت میں "وتّا" اور عام ہندستانی زبان کی کسی شاخ میں "بتیا" ہے۔

(۵) الفاظِ لغت کی تعریف وتشریح و توضیح : مندرجات یا الفاظِ لغت کے معنی یا ان کی تعریف وتشریح لغت کا اہم ترین حصّہ ہے۔ اس میں ترجیح اس معنی یا مفہوم کو دینی چاہیے جو سب سے زیادہ مروّج ہے۔ اس کے بعد ان مفاہیم کو جگہ دینی چاہیے جو کسی ایک علاقے، گروپ یا کسی مخصوص صورتِ حال سے متعلق ہوں۔ لغت میں مندرجات کے 'مترادفات' سے زیادہ ان کی توضیح کی ضرورت ہے اور اس میں ان کے امتیازی مفاہیم پر توجہ رہنی ضروری ہے۔ بقول سیموئل جونسن کے الفاظ میں "الفاظِ لغت کی تعبیر میں صراحت (کے ساتھ) ایجاز و جامعیت درکار ہے"۔ اس کے علاوہ ان تعبیرات اور معانی و مفاہیم کا علماء کے نزدیک تو درست ہونا ضروری ہے ہی لیکن ان کا بیان ایسا ہونا چاہیے کہ عام قاری بھی اُنھیں آسانی سے سمجھ سکے۔ گویا ان کا خاص پسند ہونے کے ساتھ عام فہم ہونا ضروری ہے۔

عام معیاری اُردو لغت میں نہ صرف عربی اور فارسی کے ان الفاظ کی صراحت ضروری ہے جو اُردو والوں میں مروّج ہیں بلکہ ان زبانوں کے ایسے مرکبات یا تراکیب اور فقرے بھی درج ہونے ضروری ہیں جنھیں اُردو والے تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔

پھر مندرج الفاظ کی ذیل میں ان سے متعلقہ محاورے اور ضرب الامثال بھی ضروری ہیں۔

مندرجات کے انتخاب میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اُردو کے کن مصنّفین وشعرا کے تخلیقی کارناموں کو مقدّم رکھا جائے۔ ترجیح ان مصنّفین وشعرا کو ملنی چاہیے جن کی زبان عام اُردو بول چال سے قریب ہو۔ اس سلسلے میں میرے خیال میں میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی، میرامن اور نذیر احمد کو دوسرے مصنّفین وشعرا پر فوقیت حاصل ہے۔

یہ درست ہے کہ ایسی لغت جسے عام طور پر استعمال کیا جا سکے، اس کا اصل

ماخذ تحریری زبان ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لغت صرف کتابی زبان تک محدود ہو۔ کوئی بھی لغت نگار عام روزمرہ بول چال کو نظر انداز نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ زبان کا بے بہا خزانہ ہے۔ لغت نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جو کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس پر کڑی نظر رکھے۔ اخبارات ورسائل کی زبان اسی لیے اُس کے پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کیوں کہ تحریری طور پر زیادہ تر ان ہی سے اس لسانی تغیّر کا پتا لگتا ہے جو نامعلوم طور پر زندہ زبان میں جاری رہتا ہے۔ لسانی تغیّر سے یہاں مُراد زبان میں نئے نئے الفاظ کے بننے سے بھی ہے، اُن کے تلفظ کے تغیّر سے بھی اور ان کے معانی ومفاہیم کی بڑھتی ہوئی وسعت سے بھی۔ یہ دُرست ہے کہ وسیع علاقے میں بولی جانے والی ہندستانی جیسی زبان کے سلسلے میں مندرج الفاظ کے مفاہیم کے تعیّن میں "سند" کا پیش کرنا مشکل ہوگا۔ خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب کہ معیاری ہندستانی کے مستند شاہکار موجود نہیں ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اس میں Diglossia کا قوی رجحان موجود ہے۔ یعنی اس کی تحریری اور بول چال کی صورتوں میں نمایاں فرق رہا ہے جیسا کہ ہندی اور اُردو دونوں کے تحریری سرمائے سے ظاہر ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ کام نہایت اہم ہے اور اسے کرنا ہی چاہیے کیوں کہ اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو بول چال اور روزمرّہ کی زبان ہی دراصل کسی زبان کے بولنے والوں کی نجی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرسکتی ہے۔ میں اسے نہایت اہم اس لیے کہتا ہوں کہ میں لغت کو محض ہجّے اور تلفظ ادا کرنے کے اصول وآداب کی کنجی نہیں سمجھتا، نہ میں اسے اُن الفاظ کا کوئی محافظ خانہ سمجھتا ہوں جو عام تعلیم یافتہ افراد یا مصنّفین وشعرا عام طور پر بولتے ہیں۔ مجوّزہ لغت تو ایسی ہونی چاہیے کہ ہم اس سے اُس زبان کے بولنے والوں کے مزاج، ان کے افکار وعقائد، توہّمات اور رسم ورواج اور اُن کے محسوسات سے آشنا ہوسکیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے مندرجات کے لیے اَن تھک محنت وریاضت کی ضرورت ہوگی۔ ہندستانی کے وسیع علاقے میں سماج کے تمام طبقات کے افراد سے ایسے مندرجات کے مفاہیم کے تعیّن میں رجوع کرنا پڑے گا۔ ان سے استشہاد کے بعد

ہی ان مقامی محاورات اور عام بول چال کی زبان کے الفاظ کو لغت میں جگہ مل سکے گی لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس سلسلے میں ہزار کاوشوں کے باوصف یہ پھر بھی ماننا پڑے گا کہ لغت تحریری زبان کی طرح عام بول چال کی زبان کا ساتھ کماحقہٗ نہیں دے سکتی۔ لسانی تغیّر اسے ہمیشہ کارِ پارینہ بنانے کے لیے جاری رہتے ہیں۔

عام اُردو لغت میں یہ بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ اُردو ایک وسیع علاقے میں بولی جانے والی ہندستانی پر مبنی ہے۔ اس لیے مجوزہ لغت میں ایسے مندرجات (Lexical units) کے مختلف Dialectal اختلافات کی نشان دہی ہونی مناسب ہے جو عام طور پر ہندستانی کے علاقوں میں موجود ہیں۔

پھر ایسی لغت میں زنانہ بولی' ہندستانی کے علاقے میں مختلف پیشوں اور کھیل تفریح کے مخصوص الفاظ اور اصطلاحوں کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔

'ناشایستہ' الفاظ کے بارے میں میرا خیال ہے کہ لغت نگار کے لیے ضروری یہ ہے کہ وہ کسی لفظ کو ناشایستہ نہ سمجھے۔ ہر لفظ جو اہلِ زبان اپنی روزمرّہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں اُس کے لیے مقدس ہے۔ قطع نظر اس کے کہ عریانی و فحاشی کے معیار بدلتے رہتے ہیں، لغت نگار کا کام اس زبان کے الفاظ سے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ہے،' اُس میں کیا شایستہ اور مہذب ہے اور کیا نہیں' اس کا فیصلہ کرنا اُس کا منصب نہیں۔

ایک بات اور۔ ایسی ضخامت کی عام معیاری اُردو لغت میں جسے استعمال کرنے میں دُشواری نہ ہو ایسے الفاظ کے مرکبات بھی ضرور درج ہونے چاہییں جو فارسی' عربی یا ہندوستان کی دیگر بولیوں کے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً خوش نین' راہ باٹ' بھینٹ ملاقات' حلوہ مانڈا' پبیلِ ڈاک' گورا چٹا' گھر بار وغیرہ۔ یہ مرکبات اُردو کی اس تاریخی اور تہذیبی خصوصیت کا پتا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی بقا سے مایوس ہونے کو جی نہیں چاہتا۔

مجوزہ لغت میں مندرجات کے تحت ایسی مثالیں بھی ہونی چاہییں جن سے یہ واضح ہو کہ ادب (یا عام بول چال) میں یہ کن سیاقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان مثالوں کو عہد بعہد کے مصنفین کے اعتبار سے ترتیب دینا چاہیے

تاکہ اگر کوئی چاہے تو یہ جان لے کہ ان مندرجات کے مفاہیم میں عہد بعہد کیا تغیرات ہوئے ہیں۔

(۶) مترادفات : مندرجات کے تحت ایسے الفاظ بھی ہونے چاہییں جو اُن کے مترادف یا کسی حد تک ہم معنی ہوں تاکہ مندرجات کے مفاہیم ذہن نشین ہو سکیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی لغت میں مختلف افراد کا اشتراک ضروری ہے۔ پھر ایسے اشتراک سے بھی شاید اُس وقت تک خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک ہم اپنے ادبی کارناموں کے مستند اڈیشن اور اگر ہو سکے تو مشاہیر ادب کی فرہنگیں بھی تیار نہ کریں مثلاً "فرہنگِ میرؔ"، "فرہنگِ نظیرؔ"، "فرہنگِ نذیر احمد" وغیرہ۔ پھر اس کام میں صرف ان لوگوں کو "ہاتھ ڈالنے" کی اجازت ہو جن میں کٹڑپن نہ ہو، علاقائی، لسانی اور ادبی تعصب نہ ہو، اور ان کے اندازِ فکر میں اُردو زبان کی طرح اخذ و قبول کی ایسی لچک ہو جو ہمہ گیری کی اساس ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی

اُردو کی دولسانی لغات

BILINGUAL DICTIONARIES

ایک جائزہ

زباں دانی اور زباں فہمی لغت نویسی کے بنیادی مطالبات ہیں۔ زبان دانی کا انحصار محض اس بات پر نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی زبان میں استعمال کیے جانے والے الفاظ کے صحیح "تلفظ"، املا اور رسم الخط سے واقف ہو اور نہ زباں فہمی کا مطلب یہ ہے کہ وہ مختلف الفاظ کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ زبان دانی و زباں فہمی سے مراد یہ ہے کہ زبان کے خارجی و داخلی، ظاہری و معنوی تمام پہلوؤں سے واقفیت و آگاہی حاصل ہو۔ کسی زبان کے خارجی یا ظاہری پہلو سے مراد زبان کی وہ خصوصیات ہیں، جو اس کی شکل وصورت کا تعین کرتی ہیں اور اس کی ترتیب و تنظیم، صحت و درستی کا معیار مقرر کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کے خارجی پہلو کا تعلق اس کے رسم الخط، املا، قواعد اور تلفظ سے ہے۔ زبان کے داخلی و معنوی پہلو میں جو خصوصیات شامل ہیں وہ ہیں الفاظ کے مختلف معانی، ان معانی کے اعتبار سے ان کا برمحل اور حسب موقع استعمال، خیالات کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرنے کا فن، اپنی بات سے دوسروں کو متاثر کرنے کا آرٹ یعنی معنی و مطلب کی وہ تمام نزاکتیں جو الفاظ کے ظاہری پردوں میں پوشیدہ ہیں، مفہوم و مدعا کی وہ تمام باریکیاں جو ظاہری علامات یا Symbols کی تہ میں چھپی ہوئی ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کے خارجی پہلو کا تعلق اس کے جسم اور لباس سے ہے جب کہ اس کے داخلی پہلو کا تعلق اس کی روح اور مزاج سے ہے۔ شخصیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے جسم کے خطوط کو جاننا اور لباس کے انداز کو سمجھنا جتنا ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری روح کی گہرائیوں تک پہنچنا اور مزاج کی تہوں کو اُلٹنا ہے۔ زباں دانی و زباں فہمی اس وقت تک ناقص و نامکمل رہے گی جب تک ان دونوں پہلوؤں پر نظر نہ ہوگی۔ اس اعتبار سے کسی زبان کا علم اتنی وسعت اختیار کرلیتا ہے کہ اس کے دائرے میں اس کے ادب کا علم بھی آجاتا ہے۔ زبان کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے اس کے تاریخی ارتقا اور تہذیبی پس منظر کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی زبان کی تعمیر و تشکیل میں جہاں سماجی حالات، تہذیبی روایات اور تاریخی تبدیلیوں کا ہاتھ ہوتا ہے، وہیں دوسری زبانوں کے اثرات کا دخل بھی ہوتا ہے۔ ہر زبان دوسری زبانوں کے میل جول اور تعلق سے بنتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے۔ زبان کے اس میل جول کی بنا پر ایک زبان میں دوسری زبانوں کے نہ صرف بے شمار الفاظ غیر محسوس طریقے پر شامل ہوتے رہتے ہیں بلکہ ان زبانوں کی بہت سی تہذیبی روایات بھی دبے پاؤں داخل ہوجاتی ہیں۔ اس طرح زبان کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ایک زبان کے علم کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں اور ان کی تہذیبی روایات کا علم بھی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ناگزیر ہوتا ہے۔

ایک کامیاب لغت نویس کے لیے زبان کا یہ وسیع علم نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اس کا کام محض Compiler کا نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت ایک ماہرِ لسانیات، ایک ناقد اور ایک محقق کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کا کام صرف لفظوں کے مترادفات (Equivalents) فراہم کردینا نہیں بلکہ ان مترادفات کے باریک اختلافات ظاہر کرنا، ان اختلافات کی روشنی میں الفاظ کا محلِ استعمال بتانا، الفاظ کے لغوی (Literal) اور مجازی (Figurative) معنی کی تشریح کرنا، لفظوں کی اصل کا پتا لگانا، ان کے صحیح تلفظ کا تعین اور معیاری و عوامی تلفظ کی نشاندہی کرنا، الفاظ کے مختلف مرکبات و مشتقات (Compounds and

(derivatives) اور ان کے معانی کا بیان کرنا، الفاظ کی قواعدی صورتوں (Grammatical Forms) اور ان کے پیشِ نظر ان الفاظ کے معنوی تغیرات (Semantic Variations) کو ظاہر کرنا، الفاظ اور ان کے معانی کے سلسلے میں غلط اور صحیح کا فیصلہ کرنا، متروک (Obsolete) اور مروج (Current) الفاظ کی وضاحت کرنا جیسی ضروریات بھی اس کے فرائض میں داخل ہیں۔ ایک دو لسانی لغت (Bilingual Dictionary) کے مرتّب کی ذمّے داریوں کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے براہِ راست کم سے کم دو زبانوں کا علم ضروری ہے۔ اس کی اوّلین اور بنیادی ضرورت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک زبان کے الفاظ کا ترجمہ و تشریح دوسری زبان کے الفاظ میں کرے۔ اس کے لیے یہ لازم آتا ہے کہ نہ صرف بیک وقت دو زبانوں کے مزاج اور ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کی روح تک اس کی نظر کی رسائی ہو بلکہ ان کے تاریخی ارتقا سے بھی اسے واقفیت حاصل ہو۔ ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنے کے عمل کو کامیاب اور بامعنی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نقلِ مکانی کے تمام مسائل و مراحل سے واقفیت کے ساتھ تغیّرِ زمانی کے تمام مدارج و منازل سے آگاہی بھی حاصل ہو۔ ورنہ ایک زبان کا مزاج جس کی تشکیل صدیوں کی روایات نے کی ہے، دوسری زبان میں منتقل نہ ہو سکے گا۔ ایک زبان کے الفاظ، بالخصوص ان کی ترکیبی (Synthetic) اور محاوراتی (Idiomatic) شکلوں کی دوسری زبان میں منتقلی کے عمل میں سب سے بڑی دشواری زبانوں کی یہی مزاج شناسی اور ان کی تہذیبی اقدار سے آگاہی ہے۔ زبانوں کے مزاج اور ان کے تہذیبی پس منظر سے ناواقفیت ہی کا نتیجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنے کا عمل ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے اصل زبان کی روح بُری طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا کانٹوں بھرا راستا ہے جس پر ایک دو لسانی لغت نویس Bilingual Lexicographer کو بڑی احتیاط سے قدم رکھنا اور بہت سنبھل سنبھل کر چلنا ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ لغت نویسی کے اصولوں کے بیان پر مبنی یہ تمہید بہ ظاہر کسی قدر طویل اور شاید غیر ضروری اور اصل موضوع سے ہٹی ہوئی بھی معلوم ہو لیکن ان اصولوں کا بیان اس لیے ضروری ہے کہ اس سے موضوع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور انھی کی روشنی میں زیرِ بحث لغات کی خوبیوں اور خامیوں کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں آج اچھی اور بری یک لسانی و دو لسانی (Unilingual and Bilingual) بہت سی لغتیں موجود ہیں لیکن اردو میں لغت نویسی کے اس کام کی ابتدا کا سہرا اُردو کے عالموں کے بجائے مغربی خصوصاً انگریزی علما کے سر ہے۔ جیسا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے "لغت کبیر اُردو" کے مقدمے میں لکھا ہے "اردو میں لغت پر سب سے پہلے اہلِ یورپ اور خاص کر انگریزوں نے کتابیں لکھیں۔ یہ خصوصیت کچھ اُردو ہی کے ساتھ نہیں، ہندستان کی تقریباً تمام جدید زبانوں کی لغات اوّل اوّل غیروں نے ہی لکھیں۔ البتہ اُردو پر ان کی نظرِ التفات زیادہ رہی ہے۔" اس کے اسباب کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ان مغربی عالموں نے اس سلسلے میں بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور لغات کا جو وسیع و وقیع سرمایہ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے اس نے بعد کے لغت نویسوں کے لیے بھی مشعلِ راہ کا کام دیا ہے اور جن لوگوں کے لیے یہ لغات لکھی گئی ہیں نہ صرف ان کے لیے بلکہ جن زبانوں کے الفاظ کی یہ لغات تیار کی گئی ہیں خود ان کے عامیوں اور عالموں دونوں کے لیے رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس قسم کی لغت کی کتابیں جن مغربی علما نے ترتیب دیں ان میں سے یہ قابلِ ذکر ہیں۔ جان جَیشوا کیٹلر، جارج ہیڈلی، جے فرگسن، ڈاکٹر گلکرسٹ، جان شیکسپیر، ڈاکٹر ڈنکن فوربس، ڈاکٹر فیلَن اور جان پلیٹس۔ ان سب میں دو کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہ ہیں فیلن اور پلیٹس کی لغات۔ ان دونوں لغتوں کی امتیازی خصوصیات پر مولوی عبدالحق نے جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پلیٹس کی ڈکشنری کو فیلن کی ڈکشنری پر، جس کی اپنی ترجیحی خصوصیات ہیں، کیوں سبقت اور فوقیت حاصل ہے۔ مولوی

عبدالحق ان لغات کے بارے میں "لغت کبیر اُردو" کے مقدمے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"فالن نے یہ خاص اہتمام کیا ہے کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال کی سند میں عوام کے گیت، زبان زد ضرب الامثال اور فقرے اور اساتذہ کے اشعار نقل کیے ہیں لیکن اُردو کے ادبی الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی برتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی فارسی لفظ جو اُردو زبان و ادب میں عام طور پر مروج ہیں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے الفاظ محض فضیلت آمآبی جتانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ زبان میں (خواہ وہ کوئی زبان ہو) ادبی الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں اور کوئی لغت ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ہر لفظ کے ساتھ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت کی علامت لگی ہوئی ہے، لیکن لفظ کی اصل اور اشتقاق کی تحقیق میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ کتاب کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی محنت اور کوشش کی ہے اور ڈاکٹر فالن کی تربیت کا یہ کچھ کم فیض نہیں ہے کہ ان کے ساتھ جس قدر اصحاب بطور مددگار کے کام کرتے تھے اُن سب نے کوئی نہ کوئی کتاب لغت یا زبان پر لکھ ڈالی ہے۔ پلیٹس کی لغات فالن کی کتاب کے مقابلے میں بہت زیادہ ضخیم اور وسیع ہے۔ اس نے اُردو کے ساتھ ٹھیٹ ہندی کے لفظ بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی، عربی، سنسکرت کے الفاظ کا بھی بہت کافی ذخیرہ ہے جن میں سے اکثر اُردو زبان میں مروج نہیں۔ الفاظ کے معنوں میں زیادہ تفصیل اور وسعت پائی جاتی ہے اور اکثر الفاظ کے ماخذ اور اصل کا بھی اشارہ کیا ہے لیکن معنی اور استعمال کے لیے سند نہیں دی۔ ہر اصل لفظ پہلے اردو رسم خط میں ہے، اس کے آگے

ناگری رسم خط میں اور اس کے بعد رومن حروف ہیں۔ ان دونوں فاضل لغت نویسوں کی محنت اور کاوش قابلِ داد ہے۔"

مولوی عبدالحق کی اس مختصر مگر جامع رائے سے نہ صرف دونوں لغات کی امتیازی خصوصیات کا علم ہوتا ہے بلکہ یہ اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ پلیٹس کی ڈکشنری کو فیلن کی ڈکشنری پر کیوں برتری حاصل ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ڈکشنری پہلے کی تمام لغات کا تکملہ (Perfection) ہے۔ پلیٹس نے پہلے کی تمام قابلِ ذکر لغت کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے استفادہ بھی کیا ہے اور ان پر اضافہ (Improvement) بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں اسے ہندستان میں اپنے طویل قیام اور اس کے دوران اُردو ہندی کی کتابوں اور اخباروں کے مطالعے اور عوام سے رابطے کے ذریعے ان کی بول چال کی زبان سے واقفیت نے بڑی مدد پہنچائی، جن کی وجہ سے اس کی لغت جامع اور معتبر بن گئی ہے۔ اپنی لغت کی ترتیب و تشکیل کے بارے میں خود اس نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

"In the preparation of the work now offered to the public I have availed myself of the labours of my predecessors. I can affirm, however, with confidence, that I have not followed them blindly. I believe the work will be found to be something more than a "mere compilation": that, in fact, as regards both matter and form, it will be allowed to have some claim to originality; and that the changes introduced, and the additions to the vocabulary, are so numerous and extensive that it may justly claim to be considered as substantially a new work. The fact is, I have for many years been engaged in the study of Urdu and Hindi books (in prose and vrse) and newspapers with the view

of collecting words end phrases for this work. I have thus been enebled, not only to verify most of the words given in the Dictioneries of Shekespeare and others, but to supplement them with thousends of new words end phrases and additionel meanings of words. Moreover, a long residence in India made me acquainted with much of the living Colloquial language not found in Dictionaries, which I was cereful to note".

پلیٹس نے لغت سازی کے سلسلے میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان سے ان اصولوں میں سے بیشتر کی تائید و توثیق ہوتی ہے جو اس مضمون کے شروع میں بیان کیے گئے۔ پلیٹس کی ان کاوشوں کے نتیجے میں جو کام انجام پایا اس کی وہ چار امتیازی خصوصیات بتاتا ہے :

"The distinguishing features of the work ere :-

1. The spece essigned to the etymology of words;
2. The arrangement of words which ere similerly spelt but differently derived into separate paragrephs according to their etymology.....
3. The indicating the post position by means of which an indirectly trensitive verb governs its object, and the change of meaning which frequently tekes place by the employment of different post positions efter e verb.

یہاں وہ دوسری لغات کی غلطی کی طرف ایک مثال کے ذریعے اشارہ کرتا ہے :

(e.g "qabza karna" is called e trensitive verb, although it governs the locative).

4. The admission of numerous words which do not find place in the literary language".

پلیٹس کے دعوے کی صداقت لغت کے صفحات پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے ثابت ہوجاتی ہے اور لغت کی ترتیب وتشکیل میں جن اصول وطریق کار کو اس نے پیش نظر رکھا ہے ان کی تصدیق مختلف اندراجات کے مطالعے سے ہوجاتی ہے اور لغت کی جن امتیازی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اپنی پہچان خود کرالیتی ہیں۔ لغت پر ایک نظر ڈالنے سے اس کے جو مختلف نقوش ابھرتے ہیں ان کو حسب موقع مثالوں کے ذریعے ان نکات کے تحت واضح کیا جاسکتا ہے :

۱۔ عام لغات کے برعکس اندراجات کی اصل کی نشاندہی اندراج سے قبل اُس زبان کے نام کے پہلے حرف کے ذریعے کی گئی ہے جیسے فارسی الاصل لفظ کے لیے "P" عربی لفظ کے لیے "A" اور ہندی لفظ کے لیے "H" کی علامت استعمال کی گئی ہے اور اس کے بعد لفظ کا اندراج کیا گیا ہے۔ اندراج کے شروع میں لفظ کی اصل زبان کی جانب اشارہ کرنے کے باوجود، اس لفظ کا اس زبان میں تلفظ دینے کے بعد اس کی مختصر تاریخی سرگذشت بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی ایسے الفاظ جن کی اصل تو کچھ اور ہے لیکن جو کسی دوسری زبان کے توسط سے اپنی شکل بدل کر اُردو میں داخل ہوگئے ہیں، ان کے مادے (Root) کو بھی بتایا گیا ہے اور اس کے اشتقاق (Derivation) پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ مخصوص لفظ کس شکل میں کس زبان سے متعلق ہے اور کس زبان کے توسط سے اُردو میں داخل ہوا ہے۔ اس طرح وہ تمام عربی الاصل الفاظ جو فارسی کے توسط سے اُردو میں آئے، ہیں انھیں فارسی ہی کے تحت درج کیا گیا ہے لیکن اس کے عربی مادے اور اشتقاق کو بھی واضح کردیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "حسرت" فارسی اندراج کے طور پر دیا گیا ہے لیکن قوسین میں اس کی اصل پر روشنی اس طرح ڈالی گئی ہے :

"for Arabic حسرة, infinitive noun of حسر to grieve for"

اس کے بعد لفظ حسرت کے انگریزی مترادفات (Equivalents) دیے گئے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت الاصل دخیل الفاظ کی فارسی یا پراکرت شکل کو پیش کیا گیا ہے اور اصوات و املا کی تبدیلیوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

۲۔ ہندی الاصل الفاظ کا دیوناگری املا بھی دیا گیا ہے۔

۳۔ الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط میں دیا گیا ہے اور تلفظ کی مختلف صورتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی سب سے پہلے لفظ کا معیاری (Standard) تلفظ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا عوامی تلفظ جس کے لیے وہ (Vulgar) کا لفظ استعمال کرتا ہے، دیا گیا ہے۔ جب ضرورت تلفظ کی بگڑی ہوئی یا بازاری شکل (Corrupt pronunciation) بھی دی گئی ہے جیسے "موسم" اور "سَمت" کا عوامی تلفظ "موسَم" اور "سِمت" اور "رَمَضان" کا عوامی تلفظ "رَمضان" اور بگڑا ہوا تلفظ "رَمجان"۔ آج کے لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں تلفظ کے لیے VULGAR اور CORRUPT جیسے الفاظ کی تخصیص کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور تلفظ کی ان مختلف شکلوں کو Variations یا dialectal variations کے تحت دیا جائے گا لیکن آج سے تقریباً ایک صدی قبل کی صورتِ حال پر نظر کی جائے تو پلیٹس کی محنت اور طریق کار کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

۴۔ ایسے الفاظ جن کا املا یکساں ہے مگر تلفظ مختلف ہے اور اختلافِ تلفظ کی وجہ سے معنی بھی بدل جاتے ہیں انھیں الگ الگ اندراجات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً "مَنظَر"، "مُنظَر"، اور "مُنظِر" کا املا ایک ہی ہے مگر ان کی قواعدی نوعیت، تلفظ اور معنی میں اختلاف ہے۔ مُنظِر اسم فاعل (Nominative) ہے۔ اس کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا۔ مُنظَر اسم مفعول (OBJECTIVE) ہے اس کے معنی ہیں ظاہر کیا ہوا اور مَنظَر اسم ظرف (Locative) ہے اور اس کے معنی ہیں ظاہر ہونے کی جگہ۔ ان کو الگ الگ اندراجات کے طور پر دیا گیا ہے۔

۵۔ اندراجات کی ترتیب میں یہ طریق کار اختیار کیا گیا ہے کہ مفردات (Single Words) یا لاحقوں (Suffixes) سے بننے والے مرکبات (Compounds)

کو بنیادی اندراج کی حیثیت دی گئی ہے جب کہ ان مفردات سے بننے والے دیگر مرکبات کو ذیلی اندراج کے طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ سابقوں (Prefixes) کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی صورت میں Prefix کو بنیادی اندراج اور اس سے بننے والے مرکبات کو ذیلی اندراج کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہ بات دو مثالوں سے واضح ہو جائے گی "زمین" اور اس کے لاحقوں سے بننے والے مرکبات جیسے "زمیندار" "زمیندارن" "زمینداری" "زمینی" وغیرہ کو مفرد اندراجات کی حیثیت دی گئی ہے اور "زمین" سے بننے والے مرکبات مثلاً "زمین دوز" "زمین گیر" "زمین قند" یا "زمین" سے بننے والے محاورات اور محاوراتی فقرے جیسے "زمین بوس ہونا" "زمین آسمان کا فرق" "زمین میں گڑ جانا" "زمین میں سما جانا" وغیرہ اصل اندراج "زمین" کے ذیلی اندراجات کے طور پر دیے گئے ہیں لیکن سابقوں (Prefixes) جیسے "بے" بمعنی "بغیر" کو اصل اندراج اور اس سے بننے والے مرکبات جیسے "بے آب" "بے رنگ" "بے کیف" وغیرہ کو ذیلی اندراجات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ صرف اصل اندراجات کو اردو رسم الخط میں اور ذیلی اندراجات کو رومن رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔

۶- الفاظ کی قواعدی نوعیت بھی ظاہر کی گئی ہے اور ان کی ادبی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷- ان تمام خصوصیات کے ساتھ ایک Bilingual Dictionary کی حیثیت سے پلیٹس کی ڈکشنری کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصل زبان کے الفاظ کے انگریزی مترادفات دینے میں معنی کے زیادہ سے زیادہ Shades پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً "آب" کے مختلف معانی "پانی" "چمک" "دھار" وغیرہ دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لفظ کی ترکیبی اور محاوراتی شکلوں کے معنی بھی حسب ضرورت مترادفات یا تشریحات کی شکل میں دے دیے گئے ہیں اور ان میں اصل زبان کی روح اور مزاج کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو عموماً کامیاب ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ قابل ذکر ہے کہ حسب موقع الفاظ کی معنوی توسیع اور معنوی تغیر کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً "صلوٰۃ" کے

معنی نماز ہیں لیکن اس کی جمع "صلواۃ" کے معنی اُردو میں آکر بالکل بدل جاتے ہیں اور "صلواتیں سنانا" "گالیاں دینے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یا "خوب" کے معنی "اچھا" ہیں اور واحد شکل میں اس کے معنی "خوبصورت" کبھی نہیں ہوتے مگر "خوب" کی جمع "خوباں" کے معنی "خوبصورت لوگ" "معشوق" ہوتے ہیں۔ زیرِ بحث لغت میں اس قسم کی معنوی توسیع و تغیّر کی نشان دہی کردی گئی ہے۔ اس سلسلے کی ایک دل چسپ مثال "لن ترانی" ہے۔ عربی کا یہ فقرہ بغیر کسی لفظی تغیر کے اُردو میں آکر بالکل مختلف معنی اختیار کرلیتا ہے اور اصل معنی "تو نہیں دیکھ سکتا" اُردو میں آکر "ڈینگیں مارنا" میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ پلیٹس نے اس عربی فقرے کی جو تشریح کی ہے اس میں اس پورے واقعے پر روشنی ڈالی ہے جس سے یہ متعلق ہے یعنی حضرت موسیٰ نے جب خدا کا جلوہ دیکھنے کی درخواست "ربِ ارنی" کہہ کر کی تو خدا کی طرف سے جواب "لن ترانی" ملا۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی اس سورۃ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور اس سورۃ کی وہ پوری آیت بھی نقل کی ہے جس سے یہ فقرہ لیا گیا ہے۔ اس تشریح کے بعد اس فقرے کا وہ معنوی تغیّر پیش کیا گیا ہے جو اُردو سے مخصوص ہے۔ اس قسم کی تشریحات اُردو زبان کی اکثر مبسوط یک لسانی لغات (Unilingual Dictionaries) میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

پلیٹس کی لغت کی یہ تمام خصوصیات اور لغت سازی کے وہ سائنٹفک اصول جن کی روشنی میں اس لغت کی ترتیب و تشکیل کی گئی ہے نہ صرف انگریزی کے زبان دانوں کے لیے بلکہ اُردو کے اہلِ زبان کے لیے بھی ایک نمونہ ہیں لیکن ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس نمونے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی اور آج تقریباً سو سال گزر جانے کے بعد بھی جب کہ خود اس ڈکشنری پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کی جاچکی ہے یہ ڈکشنری ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ آج کی لسانی ضروریات اور تقاضے پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پلیٹس نے جو راہ دکھائی تھی اس پر اور آگے بڑھا جائے اور نئی نئی راہیں نکالی جائیں۔ نہ صرف اُردو انگریزی اور انگریزی اُردو بلکہ اُردو ہندی، ہندی اُردو اور اسی طرح کی دوسری دو لسانی لغات تیار کی جائیں اور

پوری سنجیدگی کے ساتھ وسیع پیمانے پر اور مبسوط شکل میں تیار کی جائیں۔ اس سلسلے میں اُردو میں جو تھوڑی بہت کوشش کی گئی ہے وہ بڑی مایوس کن ہے۔ رام نرائن لال نے کاروباری ضروریات کے تحت جو انگریزی اُردو اور اُردو انگریزی لغات Students Practical Dictionary کے نام سے شائع کیں وہ صرف معمولی طلبہ ہی کو مطمئن کر سکتی ہیں اور پھر ان کی اُردو انگریزی لغت پلیٹس ہی کی لغت کا چربہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی اُردو ڈکشنری اپنی تمام تفصیل اور تفصیلی معلومات کے باوجود لغت کی چند بنیادی ضرورتوں جیسے تلفظ کی نشان دہی کی محتاج ہے۔ اس لیے اس کی ازسرِنو ترتیب کی ضرورت ہے۔ یادش بخیر ایک زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما پر دہلی یونیورسٹی میں اُردو ہندی لغت کا کام شروع ہوا تھا مگر اس کی تکمیل کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور اس کی پہلی جلد تک دیکھنا نصیب نہ ہوسکا۔ انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام مرتب اور شائع ہونے والی اُردو ہندی ڈکشنری رہنمائی کی بجائے گمراہی کا سامان زیادہ پیدا کرتی ہے اور اگر پلیٹس کی ڈکشنری لغت نویسی کا روشن پہلو پیش کرتی ہے تو یہ ڈکشنری تاریک پہلو سامنے لاتی ہے۔ اس لغت کے متعلق صحیح رائے تو وہ علما ہی دے سکتے ہیں جو اُردو سے واقف ہونے کے ساتھ ہندی زبان کے بھی ماہر ہیں لیکن اُردو کا ایک عام طالب علم بھی اس کے نقائص اور خامیوں پر انگلی رکھ سکتا ہے۔ طوالت کے خوف سے مثالوں سے گریز کیا جاتا ہے حقیقت کے جویا خود تلاش کر سکتے ہیں۔ اب اُردو دُنیا نے ترقی اردو بورڈ کے زیرِ اہتمام ترتیب دی جانے والی انگریزی اُردو لغت سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ لغت ان توقعات کے مطابق نکلے۔

مسعود ہاشمی

اُردو لغات کا تنقیدی جائزہ

فرہنگ آصفیہ، نور اللغات، فیروز اللغات و مہذب اللغات کی روشنی میں

گزشتہ صدی کے نصف آخر کو اُردو لغات کی تدوین کا دَور کہا جاسکتا ہے کیوں کہ ہندستانی، ہندستانی و انگریزی اور زبان و محاورات سے متعلق اہم اور متعدد اُردو لغات اسی دور میں مدون کی گئیں۔ بالخصوص اس صدی کے ربع آخر میں، فرہنگِ آصفیہ کی تدوین سے قبل، اُردو لغت نویسی ایک متعین نہج اختیار کر چکی تھی۔ فرہنگِ آصفیہ کی جلد اوّل کی اشاعت سے ایک سال قبل ۱۸۸۶ء میں چرنجی لال کی 'مخزن المحاورات' اور نیاز علی بیگ کی 'مخزنِ فوائد' بھی شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی تھی۔ اُردو زبان و ادب کی آبیاری شعری ماحول میں ہونے کی وجہ سے اُردو لغت نویسی پر بھی شعری تسلط قائم رہا۔ اس لیے اُردو لغات کو ایک حد تک اگر 'لغاتِ شعر' کہا جائے تو نادرست نہ ہوگا کیوں کہ اوّلاً ان لغات میں سند یا فصاحت کے لیے صرف شعرا کے کلام کو ہی معیار بنایا گیا ہے اور اکثر اندراجات کے زیادہ تر شعری مترادفات ہی دیے گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دیگر ترکیبات کے بالمقابل شعری ترکیبات زیادہ سے زیادہ شاملِ لغت کی گئی ہیں اور ممکنہ حد تک اس بات کا بھی التزام رکھا گیا ہے کہ معاملہ بندی سے متعلق تمام محاورات ضرور شاملِ لغت

کر دیے جائیں۔ غالباً یہ نتیجہ اسی شعری غلبے کا ہی تھا جو ان مولفین لغت کو تحقیقِ لغت کے میدان سے نکال کر تنقیدِ لغت کے میدان میں لے آیا اور لغت نویسی سے متعلق تمام معاملات اور مسائل کو تحقیق کی بجائے ذاتی صلاحیتِ نقد، فصاحت اور علاقائی بنیاد پر طے کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ تاہم یہاں پر اِن لغات کا جائزہ لغت نویسی کے جدید اصولوں کی بجائے خود ان مولفین کے اختیار کردہ طریقِ کار کی روشنی میں لینے کی کوشش کی گئی ہے، بصورت دیگر نہ تو ان مولفینِ لغت سے انصاف کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی تنقیدِ لغت کے موضوع سے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، فرہنگِ آصفیہ کی تدوین سے قبل اُردو لغت نویسی ایک متعین منہج اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ فرہنگِ آصفیہ کی تدوین اُردو لغت نویسی کے پختہ ماحول میں اس لیے بھی ہوئی کہ مولفِ لغت کو متعدد لغاتی رسائل کی تدوین کے علاوہ ماہر لغت نویس مسٹر فیلن کے ساتھ کام کرنے کا سات سالہ لغت نویسی کا بیش قیمت تجربہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ لغات کی تدوین کے سلسلے میں سب سے اولین پہلو چونکہ لغات کے مشمولات کا ہی سامنے آتا ہے۔ چنانچہ آغازِ بحث اس سے کیا جاتا ہے۔ الفاظ کو شاملِ لغت کرنے کے سلسلے میں بنیادی اہمیت علاقائیت پر مبنی فصاحت اور چلن کو دینے کی بنا پر ان لغات میں شامل ذخیرۂ الفاظ کو کافی حد تک نامکمل کہا جا سکتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "..... عام محاورے، خاص محاورے، فقیروں کی صدائیں، سودے والوں کی آوازیں، جواریوں، ٹھگوں، دلالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں اور مختلف پیشوں[1]" سے متعلق تمام لفظی سرمائے کو شاملِ لغت کرنے کا دعوا اس لحاظ سے کافی کمزور معلوم ہوتا ہے کہ لغت کے دیباچے نیز بعض الفاظ کی طوالتی توضیحات میں خود مصنف کے ذریعے استعمال شدہ سیکڑوں الفاظ شاملِ لغت نہیں ہیں۔ صرف دیباچے میں دو سو سے زیادہ الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو

---

[1] فرہنگِ آصفیہ، دیباچہ (صفحہ ۴۰)

لغت میں موجود نہیں ہیں، جن میں کچھ تو عام طور پر کافی مستعمل الفاظ مثلاً 'پوسنا' 'تکوین' 'ہارج' 'بوکھا' اور 'شوع' بھی شامل ہیں۔ نور اللغات میں بھی بہت سے عام الفاظ کو شاملِ لغت نہیں کیا گیا ہے اور متروکات کے نام سے کچھ ایسے الفاظ کی فہرست شاملِ لغت کر دی گئی ہے جن میں سے اکثر متروک نہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لغات کی تدوین کے وقت 'اندراجِ لغت' کے تعین کے سلسلے میں یہ صائب نظریہ نہیں اپنایا گیا کہ "... ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سُریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے ... اس کی صحت یا غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے"[1]

مہذب اللغات کے ماسوا، دیگر لغات کی تدوین کے وقت صرف شعری سرمایۂ ادب کو پیشِ نظر رکھنے کی وجہ سے ان لغات کی افادیت و معنویت کافی حد تک مجروح ہو گئی۔ مزید یہ کہ شعری ادب کے انتخاب کے سلسلے میں علاقائیت بھی پوری طرح کارفرما رہی۔ مہذب اللغات میں میر تقی میرؔ کے اشعار بھی سند کے طور پر غالباً اس لیے پیش کیے گئے ہیں کہ میرؔ کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ سے بھی منسوب رہ چکے ہیں۔ یہاں پر مہذب اللغات کے تعلق سے بابائے اردو کی اس رائے کی تصحیح ضروری ہے کہ "فصاحت کا معیار لکھنوی ہے، جس کا مدار شعرا کا کلام ہے"[2] فصاحت کا معیار بلاشک لکھنوی ہے مگر 'مدار' شعرا کے کلام کے علاوہ نثری ادب بھی ہے کیوں کہ مذکورہ لغت میں الفاظ و محاورات کی اسناد 'سیرِ کہسار' 'طلسم ہوشربا' 'فسانہ آزاد' وغیرہ سے بھی پیش کی گئی ہیں۔ اُردو لغات کو زیادہ تر شعری سرمایے تک محدود رکھنے کے لیے مولفینِ لغت کو اتنا موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا جتنا کہ معیاری نثری سرمایے کی کم یابی کو۔ کیوں کہ استعاراتی انداز سے بوجھل نثری زبان

---

[1] انشاء اللہ خاں انشاء (دیباچہ دریائے لطافت)

[2] مولوی عبدالحق (دیباچہ لغت کبیر۔ مطبوعہ پاکستان)

سے لغات کا تعین بہت مشکل تھا۔ فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات و مہذب اللغات کے علی الرغم فیروز اللغات میں کچھ قدیم و متروک الفاظ اور الفاظ کے قدیم و متروک معنی کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس سقم کے ساتھ کہ ان دونوں باتوں کے سلسلے میں سند نہیں دی گئی ہے۔

'اندراجِ لغت' کے تعین کی طرح تلفظ کی نشان دہی کے سلسلے میں بھی ان لغات میں عدم یکسانیت پائی جاتی ہے۔ طریقِ کار کی اس عدم یکسانیت کا مشاہدہ مختلف لغات ہی میں نہیں ہوتا بلکہ لغتِ واحد بھی اس کا شکار ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں تو تلفظ کا التزام ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ نور اللغات اور مہذب اللغات میں اکثر الفاظ کے تحفظ کی، اور فیروز اللغات میں تمام الفاظ کے تلفظ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان دونوں لغات میں بیک وقت ایک سے زائد طریقِ کار بروئے کار لائے گئے ہیں۔ نور اللغات میں بہ ایں طور کہ کچھ الفاظ کا تلفظ ہم وزن یا مساوی الحرکات الفاظ (مثلاً صیغہ بروزن زینت یا غیور بروزنِ غفور) کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے تو کچھ الفاظ کا تلفظ توضیحی صورت میں (مثلاً شرطیہ بالفتح و کسرِ سوم یائے معروف مشدد و مفتوح) مہذب اللغات میں تلفظ کی نشان دہی ان مذکورہ دونوں طریقوں کے علاوہ عروضی ارکان (مثلاً دو رنگ بروزن فعلن اور دورنگی بروزن فعولن) کی صورت میں بھی کی گئی ہے، اور ایک لفظ سے متعلق اختلافِ تلفظ کو بہ یک وقت دو مختلف الحرکات الفاظ کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے جیسے خورشید بروزن 'پرپیچ' اور بروزن 'خوگیر'۔ فیروز اللغات میں تمام مفرد الفاظ کے تلفظ کی نشان دہی ہجائی تقسیم کے ذریعے کی گئی ہے۔

ان لغات کو ماخذ لسانی یا مادّے کے تعین کے لحاظ سے بھی مختلف درجوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات ماخذ یا اصل کی نشان دہی تحقیقی بنیاد کی بجائے سُنے سُنائے[1] قصّوں یا قیاس کی بنیاد پر کیے جانے کی مثالیں بھی

---

[1] مثلاً فرہنگِ آصفیہ میں لفظ 'کناگت' کے ماخذ کی نشان دہی اس طرح کی گئی ہے:

"... بلکہ پنجاب میں تو یہ دستور ہے کہ کنواری لڑکیاں کناگت کے شروع ہونے سے ختم ہونے (باقی اگلے صفحے پر)

ملتی ہیں۔ ان لغات میں مفردات کی اصل یا ماخذِ لسانی کی نشان دہی تو خیر کافی حد تک صحیح کی گئی ہے مگر مرکبات کی اصل کی نشان دہی کے وقت ان کے اجزاے ترکیبی کو مدِ نظر نہ رکھ کر کافی تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کے استثنا کے ساتھ، تمام لغات میں عربی الاصل مرکبات کو بے محابا 'فارسی' قرار دے دینے کی روایت کا عام مشاہدہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دو عام مستعمل مرکبات راحت طلب اور مشکل کشا لیجیے۔ راحت طلب کے دونوں اجزاے ترکیبی (راحت + طلب) عربی الاصل ہونے کے باوجود، ان دونوں کو مہذب اللغات اور نور اللغات میں 'فارسی' لکھا گیا ہے۔ مشکل کشا کا جزو اوّل عربی اور جزوِ ثانی فارسی لاحقہ ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اختیار کردہ طریقِ کار کے مطابق اس کو بھی (ع + ف) لکھنا چاہیے تھا مگر پوری ترکیب کو صرف 'عربی' لکھا گیا ہے اور نور اللغات میں صرف فارسی۔ اس سے یہ ایک بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ماخذِ لسانی یا اصل سے متعلق ان مولفینِ لغت کا نقطۂ نظر واضح نہیں تھا بلکہ ایک حد تک یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ یہ حضرات ماخوذ لفظ کی اصل کی نشان دہی کے سلسلے میں اصل زبان اور وسیلے کی زبان کے درمیان امتیاز قائم نہیں کر سکتے تھے۔ فارسی کے وسیلے سے اُردو

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) یک روزہ اپنے گھر سے باہر چلی جاتی ہیں اور وہاں باہم خوب ایک دوسرے کی گت بناتی ہیں۔ عجب نہیں کہ اس کا یہی ماخذ ہو۔ مگر بعض پنڈت یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ لفظ اصل میں 'کرناگت' تھا۔ جس وقت راجا کرن بڑا سخی اور دیگر اشیا کی بجائے صرف سونے کا دان پن کرنے والا تھا، مرگیا اور فرشتے اسے سورگ میں لے گئے تو وہاں اس کے کھانے پینے کے واسطے سونا ہی سونا ملا، جو اس کے کسی کام کا بھی نہ تھا۔ پس اس نے پندرہ روز کے واسطے پھر دُنیا میں آنے کی درخواست کی اور اب کی دفعہ پیدا ہو کر اناج اور غلے ہی غلے کا پن کیا۔ پس جب سے کناگت کی رسم جاری ہوگئی۔ یعنی راجا کرن کی گت' (حالت) سے منسوب۔" (فرہنگِ آصفیہ جلد سوم۔ صفحہ ۵۶۹)

گویا کہ پنجاب کی لڑکیاں ایک دوسرے کی گت بناتی ہوں یا نہ بناتی ہوں، یا راجا کرن کی جو بھی گت ہوئی ہو، یہاں پر کناگت کی 'گت' ضرور بنا کر رکھ دی گئی ہے۔

میں دخیل عربی الاصل الفاظ کو عربی سے ہی منسوب کرنے کی بجائے 'فارسی' قرار دینے کی اس روش سے بھی اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ الفاظ کی اصل کا تعین استعمالِ معنی کی بنیاد پر بھی کیا گیا ہے۔ عربی الاصل یا فارسی الاصل کوئی بھی لفظ عربی یا فارسی کے برخلاف اگر کسی مخصوص یا بعید معنی میں اُردو میں مستعمل ہوا ہے تو اُسے اصل زبان کی بجائے اُردو سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ضرور کو 'عربی' لکھنے کے بعد فرہنگِ آصفیہ میں ضرورت مند اور ضروری کو اُردو قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح مہذب اللغات میں بھی اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہونے کا مقصد لفظ کے صرف اُردو استعمال پر روشنی ڈالنا بھی ہو سکتا ہے مگر جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے زمیندار صرف ہندوی فارسی یا اُردو کی اصطلاح ہے، اس لیے کہ اگر کسی لفظ کو 'اُردو' قرار دینے کے لیے استعمالِ اُردو کو بھی بنیاد بنایا گیا ہے تو زمینداری کی طرح زمیندار کو بھی اُردو ہی قرار دیا جانا چاہیے تھا۔ غرضیکہ اس طرح الفاظ کو اردو قرار دینے کا تناسب فرہنگِ آصفیہ اور فیروز اللغات میں دیگر لغات کے بالمقابل زیادہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رویّہ صرف ایسے الفاظ کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے جن کی اصل یا جن کا ماخذ متحقق نہیں ہو سکا، کیونکہ 'ذرا'، 'حیادار' (مہذب اللغات) اور قلا (آصفیہ) وغیرہ ایسے الفاظ نہیں جن کی اصل نامعلوم ہو۔ قلا کو تو خود مولفِ فرہنگِ آصفیہ نے ہندی کلا کی شکل قرار دیا ہے جس کی رُو سے اُسے اُردو لکھنے کی بجائے مورّد لکھنا چاہیے تھا۔ اس لیے مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ کہوں کہ ایسی صورتِ حال سے اُردو لغت میں شامل ذخیرۂ الفاظ کو 'اُردو' اور غیر اُردو میں تقسیم کر دینے کی فاحش غلطی سامنے آتی ہے۔

ان مولفینِ لغت کے تبحّرِ علمی، زبان دانی، محاورہ شناسی، جذبۂ خدمت اور ان کی ان تھک محنت کے اعتراف سے روگردانی کسی طور پر ممکن نہیں، لیکن لغت نویسی کے سلسلے میں سائنسی طریقۂ کار یا منطقی شعور کے قدرے فقدان کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لفظ کی ادبی حیثیت کے تعین یا کسی لفظ کو متروک، قدیم، بازاری، عوامی، گنوار وغیرہ قرار دینے کی بابت اختلافِ رائے کی گنجائش بہرطور باقی رہتی

ہے مگر جہاں تک لفظ کی قواعدی نوعیت کا تعلق ہے کسی بھی قسم کے اغماض کو روا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اختلافِ علاقہ کی بنیاد پر لفظ کی تذکیر و تانیث بھی اختلافی ہو سکتی ہے مگر اس کی اسمی، فعلی یا صفتی نوعیت کے تعین کے متعلق کسی بھی قسم کی چشم پوشی قابلِ درگذر قرار نہیں دی جا سکتی۔ اُردو کی ان لغات میں اس چشم پوشی کا احساس اسما کے مقابلے میں صفات کے تعلق سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ 'سمیت' لیجیے۔ آصفیہ میں قواعدی نوعیت کے لحاظ سے اسے اور اس کے مترادف "ساتھ" یعنی دونوں کو تابعِ فعل بتایا گیا ہے۔ نور اللغات میں 'سمیت' کی قواعدی نوعیت کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے مگر اس کے مترادف 'ساتھ' کو صرف اسم بتایا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات کے علی الرغم، یعنی "تابع فعل یا اسم بتانے کی بجائے فیروز اللغات میں اس کے صرف صفت ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اور اس بوالعجبی کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے مترادف 'ساتھ' (بمعنی ہمراہ، شریک، ساتھ میں) کو بلا پس و پیش اسم قرار دے دیا گیا ہے۔ ایسی صورتِ حال کے پیش آنے کی وجہ ان مولفینِ لغت کی اس اصول سے عدم واقفیت قرار دی جا سکتی ہے کہ لفظ بیک وقت نحوی و لغوی عناصر کا حامل ہوتا ہے اور اس کی قواعدی یا نحوی نوعیت اس کے معنوی استعمال کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ یعنی لفظ کی نحوی نوعیت کی تبدیلی سے اس کی معنوی نوعیت یا معنوی نوعیت کی تبدیلی سے اس کی نحوی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس لحاظ سے جو الفاظ جس قدر زیادہ چلتی میں ہوتے ہیں ان کا قواعدی عنصر (Grammatical Element) اتنا ہی زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اس کی مثال کچھ، کیا، کہ اور سبھی جیسے الفاظ سے پیش کی جا سکتی ہے۔ لفظ کی قواعدی نوعیت کے سلسلے میں مہذب اللغات میں محتاط طریقہ اس طرح اختیار کیا گیا ہے کہ لفظ کی قواعدی یا معنوی نوعیت کی تبدیلی کے لحاظ سے اندراجات جدا جدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً زیرِ بحث لفظ 'سمیت' کو صفت لکھا گیا ہے اور ایک بار ہی درج کیا گیا ہے، اس کے مترادف ساتھ کو قواعدی و معنوی نوعیتوں کے اختلاف کے اظہار کے ساتھ دس جداگانہ اندراجات

کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

فیروز اللغات کے ماسوا، زیرِ بحث تینوں لغات میں محاورات کو فعل (لازم / متعدی) لکھ دینے کی عام روایت ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ اگر محاورے کی صحیح تعریف کا عدم تعین قرار دی جاسکتی ہے تو دوسری ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فعل کی تعریف اور اس کا لزوم و تعدد بھی ان مولفینِ لغت کے ذہن میں واضح نہ تھا ورنہ فرہنگِ آصفیہ میں بخار دل میں رکھنا اور ہاتھ نہ رکھنے دینا کو فعل اور لازم، نیز سر نہ اٹھانے دینا کو فعل متعدی نہ لکھا گیا ہوتا۔ جب کہ صرف رکھنا کو متعدی لکھا گیا ہے۔ محاورات اور مصادر کے درمیان امتیاز نہ کرنے کی صورت میں اصل مصادر کو اندراج لغت نہ بنا کر مرکب صورت میں بنایا گیا ہے۔ مثلاً مہذب اللغات میں چھید ڈالنا، چھید کرنا کے اندراجات تو ملتے ہیں مگر نفس چھیدنا کا رواج نہیں۔

ان لغات میں الفاظ کے معنی توضیحی صورت میں بہت کم دیے گئے ہیں اور مترادفاتی صورت میں بہت زیادہ۔ کچھ الفاظ کے مترادفات نہ ملنے کی صورت میں، ان کی وضاحت ایسے انداز سے کی گئی ہے کہ مفہوم یا تو خبط ہو کر رہ جاتا ہے یا پوری طرح واضح نہیں ہوپاتا۔ مثلاً نور اللغات میں فلکیات کی تعریف اس طرح ہے: "فلک سے متعلق چیزیں"۔ اسی طرح فالج کی یہ تعریف بھی قابلِ غور ہے: "ایک بیماری کا نام جس سے آدھا بدن بیکار ہو جاتا ہے"۔ یا سفرہ بندی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے — "مالدار کے چالیسویں میں دو تھیلیاں، ایک میں نقل دوسری میں میوہ ایک بکرے یا بکری کے ساتھ بھیجتی اور اس کو سفرہ بندی کہتی ہیں"۔ اسی طرح فرہنگِ آصفیہ میں بھی 'سپاس' اور 'سپاس گزاری' کے درمیان معنوی فرق قائم نہ کرکے دونوں کے معنی 'شکر گزاری' اور 'اظہارِ احسان مندی' دیے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ دل چسپ رُخ بھی سامنے آتا ہے کہ گاہے گاہے ایسے معنی کا بھی استنباط کر لیا گیا ہے جن کا لفظ سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر مہذب اللغات میں رگ کے ایک معنی دیے گئے ہیں — "دودھ پلانے والی گائے کا اثر" اور حوالہ دیا گیا ہے نور اللغات کا — نور اللغات میں اس کے معنی دیے

گئے ہیں — "دودھ پلانے والی کا اثر" تحقیق و جستجو کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ معنی کی یہ بوالعجبی تمام تر نقل کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے کیوں کہ رگ کے ایک معنی مولفِ فرہنگِ اثر یہ بھی لکھتے ہیں — "دودھ پلانے والی گائے۔ اثر" کے بعد دیگرے دو حضرات نے نقل کرتے وقت فرہنگِ اثر کی عبارت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا' اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح نوراللغات میں ہی 'سرد' کے معنی "بہ کنایہ ٹھنڈی آہ . . ." دیے گئے ہیں اور سند کے طور پر آتش کا یہ شعر دیا گیا ہے ؎

رفع حجاب یار کیا آہِ سرد نے
کھولے نسیم صبح نے بندِ قبائے گل

جس میں "آہِ سرد" کے معنی ٹھنڈی آہ ہوں گے نہ کہ صرف 'سرد' کے۔ یہ معاملہ صرف مرکبات یا مفردات تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ محاورات اور ضرب الامثال کی وضاحت بھی بسا اوقات مضحکہ خیز انداز میں کی گئی ہے جس سے قدرے مفہوم یا محلِ استعمال کی نشان دہی تو ہوتی ہے نفسِ معنی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مثلاً 'داشتہ آید بکار' کے معنی — "کسی چیز کے حفاظت سے رکھنے کے موقع پر بولتے ہیں" یا "زبان سے بیٹا بیٹی پرائے ہوتے ہیں" کی وضاحت اس طرح کی ہے — "انسان کو زبان کا بڑا پاس رکھنا چاہیے" (نوراللغات) نیز یہ مثل کہ — "حکمت سے بکری نو بچے دیتی ہے" اس طرح واضح کی گئی ہے کہ — "جب اپنی کوئی تدبیر کارگر ہوجاتی ہے تو مزاحیہ انداز میں فخریہ کہتے ہیں" یا اسی طرح یہ مثل کہ — "دشمن کون! ماں کا پیٹ" اس طرح واضح کی گئی ہے کہ — "بھائیوں میں اگر دشمنی ہوجائے تو سخت ہوتی ہے" ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اندراجاتِ لغت کی وضاحت کے وقت ان مولفینِ لغات کی توجہ اندراج کے مفہوم کی طرف زیادہ اور اس کے لغاتی معنی (LEXICAL MEANING) کی طرف کم رہتی تھی جس کی وجہ سے وضاحت کے علاوہ مترادفات کے انتخاب کے سلسلے میں بھی یہی روا روی راہ پا گئی۔ مثلاً الفاظ کے استعاراتی معنی کو مترادفات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرہنگِ آصفیہ میں سانپ کے ایک معنی رسّی یا نوراللغات میں قرض کے ایک معنی 'نکاح' بھی درج کیے گئے ہیں جب کہ سانپ کہہ کر رسّی یا قرض کہہ کر نکاح قطعاً مراد

نہیں ہوتا۔ فرہنگِ آصفیہ میں ہی 'ساخت' کے معنی بناوٹ کے ساتھ ساتھ تصنّع' اور تصنّع کے تتبع میں تکلف بھی دے دیے گئے ہیں جب کہ کجا ساخت و کجا تکلف۔ اسی طرح گھلنا، پگھلنا اور گلنا کو بھی ایک دوسرے کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ لغاتی معنی (LEXICAL MEANING) پر توجہ نہ دینے کا ثبوت اس طرح بھی ملتا ہے کہ حالتِ مصدری پر مبنی اسماے مرکب کے معنی اسمی صورت کی بجائے فعل یا مصدری صورت میں دیے گئے ہیں۔ جیسے 'سفلہ نوازی' کے معنی ــ "کمینے پر مہربانی کرنا" یا "سپر اندازی' کے معنی ــ "ہتھیار ڈال دینا" یا 'دست اندازی' کے معنی ــ "ہاتھ ڈالنا" یا 'دیدہ بازی' کے معنی ــ "تاک جھانک کرنا" (مہذب اللغات و نور اللغات) یا 'دیس نکالا' کے معنی ــ "جلاوطن کر دینا" (فیروز) اور 'دیکھا دیکھی' کے معنی ــ "ایک دوسرے کی ریس سے کوئی کام کرنے لگنا" (آصفیہ و فیروز) وغیرہ وغیرہ

اختلاف راے کی گنجایش کے ساتھ محاورات کے اندراج کے تعلق سے بھی چند مفروضات مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جن لغات میں اسناد بھی دی گئی ہیں ان میں محاورات کا اندراج اصل لفظ کی بجاے سند میں مذکور ترتیب الفاظ کے مطابق کیا گیا ہے۔ مثلاً 'دال میں کچھ کالا کالا ہے' کی بجاے 'کچھ دال میں کالا کالا ہے' درج کیا گیا ہے کیوں کہ سند میں پیش کیے گئے مصرع (ہم نے تو یاں تاڑ لیا کچھ دال میں کالا کالا ہے) میں یہ محاورہ اسی ترتیب سے مستعمل ہوا ہے ــ بعض اوقات محاورات کی سند یا غلط پیش کی گئی ہے یا کلام سے غلط استنباط کیا گیا ہے کیوں کہ محاورہ درج کیا گیا ہے ــ کلیجے سے دھواں اُٹھنا، لیکن سند میں یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

لگائی آگ کس نے میرے گھر کو
دھواں سا کچھ تو اُٹھتا ہے جگر سے
(آصفیہ)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

مجیب صاحب۔ احوال و افکار			مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق، شہاب الدین انصاری، عبداللطیف اعظمی	۹۰/=
حیاتِ عابد	(سوانح)		مرتبہ ڈاکٹر صغرا مہدی	۴۵/=
اقبالیات کی تلاش	(ادب)		عبدالقوی دسنوی	۳۵/=
نقدِ بجنوری	(ادب)		ڈاکٹر حدیقہ بیگم	۲۵/=
بانکلیات	(طنز و مزاح)		یوسف ناظم	۱۸/=
تلامذۂ غالب	(غالبیات)		مالک رام	۷۵/=
انٹی گونی	(ڈراما)	سوفوکلیز	مترجم۔ قیصر زیدی	۹/=
اسلام دورِ حاضر میں	(منتخب مضامین)	ولفرڈ کینٹول اسمتھ	مرتبہ پروفیسر مشیر الحق	۳۶/=
اسلامیات	(تحقیق)		مالک رام	۲۸/=
لفظوں کا آسمان	(شعری مجموعہ)	سیتا کانت مہاپاتر	مترجم کرامت علی کرامت	۲۰/=
سلسلۂ روز و شب	(خود نوشت)		صالحہ عابد حسین	۶۵/=
دوہے	(شعری مجموعہ)		جمیل الدین عالی	۱۲/=
وجد شاعر اور شخص	(ادب)		مرتبہ یوسف ناظم	۲۵/=
عمرو بن العاص	(سوانح)		مولانا اسلم جیراجپوری	۶/=
آسان اُردو	(تعلیم)		شکیل اختر فاروقی	۶/=
غبارِ کارواں	(سوانح)	بیگم انیس قدوائی	مرتبہ پروفیسر انور صدیقی	۲۸/=
شرِ چیزے دیگر است	(ادب)		عمیق حنفی	۲۸/=
خطباتِ عیدین	(خطبات)		محمد تقی امینی	۲۱/=
بچوں کا آرٹ	(آرٹ)		عبیدالحق	۲۸/=
ادبی سماجیات	(ادب)		ڈاکٹر محمد حسن	۲۱/=
الفاظ کا مزاج	(ادب)		غلام ربانی (مرحوم)	۲۱/=
کلیاتِ عرش ملسیانی	(کلیات)		مرتبہ مالک رام	۷۵/=
کہانی کے پانچ رنگ	(ادب)		شمیم حنفی	۲۴/=
تعلیم، نظریہ اور عمل	(تعلیم)		ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/=
علامتوں کا زوال	(ادب)		انتظار حسین	۳۶/=
شعورِ ادب	(انتخاب نثر و نظم)		مرتبہ ادارہ	۱۸/=
برکت ایک چھینک کی	(مزاحیہ مضامین)		وجاہت علی سندیلوی	۱۵/=
عالم پناہ	(ناول)		رفیعہ منظور الامین	۳۰/=
اُداس موڑ	(ڈرامے)		ابراہیم یوسف	۱۲/=
نیلی ساری	(افسانے)		خواجہ احمد عباس	۱۲/=
مکتی بودھ	(افسانے)		راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
حضرت جنید بغدادیؒ	(تصوف)		ضیاء الحسن فاروقی	۳۵/=
تقریر و تعبیر	(تقاریر)		محمد ہدایت اللہ	۱۵/=
فراقؔ، شاعر و شخص	(ادب)		مرتبہ شمیم حنفی	۳۵/=
معاصر ادب کے پیش رو	(تنقید)		ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/=
ذکرِ خیر	(خاکے)		یوسف ناظم	۱۸/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی